مولانا عبید اللہ سندھیؒ



سندھ ساگر اکادمی

یعنی

حزب ولی اللہ دہلوی کی اجمالی تاریخ کا مقدمہ

# مولانا عبید اللہ سندھیؒ


ترتیب و تدوین

پروفیسر محمد سرور

سابق استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی



سندھ ساگر اکادمی ○ لاہور

کتاب مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

محمد صدیق نے
حاجی محمد حنیف اینڈ سنز پرنٹرز لاہور
سے چھپوا کر شائع کی۔
[illegible] 200/- روپے

دونوں کو حتی الوسع ایک دوسرے سے مربوط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے جہاں کہیں کسی حاشیے کا مضمون اصل متن کے سلسلۂ بیان میں نہیں کھپ سکتا تھا، اسے یا تو نیچے حاشیے میں لکھ دیا گیا ہے۔ یا وہ کتاب کے آخر میں ضمیمہ جات کی شکل میں آگیا ہے۔ اس سلسلے میں دوسرا کام یہ کیا گیا کہ متن اور حواشی میں فارسی اور عربی کی جو عبارتیں تھیں، اور وہ کافی تعداد میں تھیں، ان کا راقم الحروف نے عام فہم اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ نیز کتاب کے مضامین کی ترتیب میں کچھ کچھ جو گنجلک تھی، اسے بھی زیر نظر اشاعت میں سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں جہاں تک راقم الحروف سے ہو سکا، اور جس حد تک کہ موقع اور محل اجازت دیتے تھے، اس نے اصل کتاب (متن و حواشی دونوں) کی زبان اور اس کے پیرایۂ بیان کو آسان کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ خیال ہے کہ اس کے بعد اس کتاب کا ہمارے متوسط طبقوں کے لئے بھی سمجھنا مشکل نہ رہے گا۔

اصل کتاب کے مطالب اور حواشی کے مضامین میں کہیں رد و بدل نہیں کیا گیا۔ اور اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ اشاعتِ اول میں جو بھی مضامین آ چکے ہیں، اس اشاعت میں ان میں سے کوئی چیز بھی نہ چھوٹے۔ ممکن ہے کتاب کا نقشِ ثانی ظاہری شکل و صورت میں نقشِ اول سے قدرے مختلف ہو۔ لیکن جہاں تک اس کے مطالب کا تعلق ہے، نقشِ ثانی بعینہٖ نقشِ اول کی تجدید ہے۔

جنوری ۱۹۴۲ء

محمد سرور، بیت الحکمت، جامعہ نگر، دہلی

میں اپنے ذمہ لیتا ہوں۔ جو ناظرین کرام کو مقالے کی ترتیب و تالیف میں نظر آئیں گی ؎

نہ گلم نہ برگ سبزم نہ درخت سایہ دارم
ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

فقط الراقم

محمد نور الحق العلوی
تاج پورہ ، لاہور

طور پر جو انقلاب ہمارے دماغ میں پیدا ہوا اس کا لازمی نتیجہ کہ "واقعہ بالاکوٹ کے بعد جس قدر نئی تحریکیں ہندوستان میں پیدا ہوتی رہیں، ان میں سے کسی ایک کو بھی ہم صحیح نہیں مانتے۔"

اس وقت ہم اس اجتماعی تحریک کے ایک مختصر مقدمہ کا تعارف کرانا چاہتے ہیں جس میں امام ولی اللہ سے شیخ الہند تک اہم واقعات کا اشارۃً ذکر کر دیا ہے۔ اسے مقدمہ تاریخ حزب ولی اللہ (حزب ولی اللہ کی تاریخ کا مقدمہ) کہا جائے گا۔ امام ولی اللہ کی فلاسفی کی حقیقت جس طرح ہم سمجھے ہیں لوگ اسے ہرگز سمجھا نہیں سکتے، جب تک اس تحریک کی تاریخ نہ پڑھا لیں۔ ہمارا یہ "مقدمہ" اس تاریخ کے لئے تمہید کا کام دے گا۔ اصل میں یہ کام یعنی وطنی تاریخ کی تحقیق ہمارے ذہین نوجوانوں کا ہے۔ اگر وہ ادھر متوجہ ہوئے تو ہمارے اس فکر کی بنیاد پر ایک "ہسٹاریکل کالج" کھڑا کر دیں گے۔

حکیم الہند امام ولی اللہ نے ۲۱ ذی قعدہ ۱۱۴۳ھ (۵ مئی ۱۷۳۱ء) سے دہلی کے مفاسد کو ختم کرنے کے لئے توکلاً علی اللہ اپنی ذمہ داری پر ایک مستقل انقلابی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ غالباً اس سے پانچ سال پہلے وہ اس مطلب کے لئے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ۱۱۳۸ھ میں شروع کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

تاریخ ہند کا یہ عظیم الشان واقعہ انقلاب فرانس سے ۵۸ سال پہلے ہوا۔ حکیم الہند امام ولی اللہ نے اپنا نصب العین متعین کیا۔ اپنے پیروکار اہل تمدن کی جمعیت مرکزیہ بنائی اور اس کی شاخیں ملک میں پھیلیں۔ اس طرح حزب ولی اللہ ایک منظم پارٹی کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اس نے حکومت موقتہ (PROVISIONAL GOVERNMENT) بنائی۔ لیکن ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) بروز جمعہ بالاکوٹ کے معرکۂ شہادت میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

اس صدی میں اس تحریک کے لئے تین امام ظاہر ہوئے اور ایک امارت منعقد ہوئی۔

۱۔ امام ولی اللہ ۱۱۱۴ھ تا ۱۱۷۶ھ

۲۔ امام عبدالعزیز ۱۱۵۹ھ تا ۱۲۳۹ھ

۳۔ امام محمد اسحاق ۱۱۹۷ھ تا ۱۲۶۲ھ

حکومت مؤقتہ کے امیر شہید سید احمد سنہ ۱۲۰۱ھ تا سنہ ۱۲۴۶ھ

اس سال اس تحریک کا پہلا دور پورا ہوا۔ اس دور میں حزب ولی اللہ میں ایک ایسا انسان بھی پیدا ہوا جو نہ امیر تھا نہ امام۔ لیکن اپنی مبارک زندگی اور شہادت سے اپنے جدّ امجد کی تحریک کو زندہ کر گیا۔ وہ مولانا محمد اسمٰعیل شہید بن عبد الغنی بن ولی اللہ ہے۔

اس تحریک کا دوسرا دور امام محمد اسحاق نے سنہ ۱۲۴۶ھ سے شروع کیا۔ آپ سنہ ۱۲۵۷ھ تک دہلی میں رہے۔ اور سنہ ۱۲۶۲ھ تک مکہ معظمہ میں۔ دہلی میں ان کے نائب مولانا مملوک علی تھے۔ اور ان کے بعد امیر امداد اللہ بارہ برس تک دہلی میں رہے یعنی سنہ ۱۲۷۳ھ تک۔ اور اس کے بعد مکہ معظمہ چلے گئے۔

ہندوستان میں ان کے پہلے نائب مولانا محمد قاسم سنہ ۱۲۹۷ھ تک۔ پھر مولانا رشید احمد سنہ ۱۳۲۳ھ تک۔ اور ان کے بعد شیخ الہند مولانا محمود حسن سنہ ۱۹۲۰ء تک اس تحریک کے سرپرست رہے۔ اس سال تحریک مذکور کا دوسرا دور ختم ہوا۔

تحریک کے تیسرے دور کو مولانا شیخ الہند نے سنہ ۱۹۲۰ء سے تھوڑا عرصہ پہلے شروع کیا تھا۔

عبید اللہ سندھی
بیت الحکمت دہلی
۲۲ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ ہندی
ومتی الشیع العامت تحرفونی

# فہرست مضامین

## تعارف

## الصدر الحمید امام محمد اسحاق



## حزب ولی اللہ کا دوسرا دور



## حزب ولی اللہ کا تیسرا دور

# ضمیمہ جات

# تعارف

محمد سرور

آج کل ہندوستان کی تاریخ کی نئی نئی تعبیریں ہو رہی ہیں۔ زیادہ دن نہیں گزرے کہ ہم سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں صرف انگریز مصنفوں کی لکھی ہوئی ہندوستان کی تاریخیں پڑھتے تھے۔ یہ لوگ ظاہر ہے برطانوی عہد کو سراہتے اور ہندو اور مسلمان دونوں کے زمانوں کو برا کہتے تھے۔ موجودہ قومی تحریک شروع ہوئی تو بھارت میں انگریزی راج قابل نفرت قرار پایا اور ہندوستان کی تاریخ نئے ڈھنگ سے لکھی جانے لگی۔

ہندوستان کی موجودہ "قومی تحریک" کے ہراول بیشتر ہندو ہیں۔ شروع شروع میں اس تحریک کا سارا تار و پود بھی خالص ہندوانہ تھا۔ گو اصولاً یہ تحریک سارے ہندوستان کی تھی لیکن عملاً کافی عرصہ تک یہ صرف ہندوؤں تک محدود رہی۔ اس کا لازمی نتیجہ نکلا کہ مسلمان بحیثیت مجموعی اس "قومی تحریک" سے صرف بے تعلق ہی نہیں رہے بلکہ بڑی حد تک اس کی مخالفت بھی کرتے رہے۔ دوسری طرف ہندوؤں نے مسلمانوں کو بدیسی سمجھنا شروع کیا اور ہندوستانی تاریخ کا اسلامی عہد ان کی نظروں میں تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا گیا۔ بنگال کی تقسیم کے خلاف ہندوؤں کی یہ جو تحریک ابھری، مہاراشٹر والوں کی تحریک آزادی اور بندے ماترم کے گیت کا کانگرس کے پلیٹ فارم سے گایا جانا، یہ سب اسی تاثر کی یادگاریں ہیں۔

بات ان ہندو قوم پرستوں کے نقطۂ نظر سے ایک حد تک معقول بھی تھی۔ اگر انگریز کی حکومت جابرانہ ہے اور اس کو ختم کرنا ہر ہندوستانی قوم پرور کا فرض ہے۔ تو مسلمان بادشاہوں کی حکومت ان کی نظر میں برطانوی حکومت سے کیا کم جابرانہ تھی۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ انگریز کو تو برا کہا جاتا

سے علیحدہ رہنے کے لئے ان کو وجہ جواز مل سکے۔ مسلمانوں کی پوزیشن بڑی صفائی سے محمد علی مرحوم نے اپنے خطبہ میں جو انہوں نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے کوکناڈا میں پڑھا تھا، نہایت تفصیل سے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ مسلمانوں کا شروع میں سیاست کے متعلق موقف سے الگ رہنا ہی درست تھا۔ لیکن جب علی گڑھ کے قیام اور مسلمانوں میں انگریزی کی تعلیم کی عام اشاعت پر کافی عرصہ گزر چکا اور ان میں سیاسی بیداری کے آثار نمایاں ہو چکے تو پھر مسلمانوں کے لئے کانگریس میں شریک ہونا ضروری ہو گیا۔ لیکن دوسرے لفظوں میں مرحوم نے بیان کیا کہ آزادی کی موجودہ تحریک میں مسلمان بالعموم پیش پیش تھے اور اسی طرح اقلیت کا سوال ہندوؤں کے سربراہ اس طرح گاندھی جی قائم رہے اور محمد علی اور شوکت علی ان کے رفیق اور پیرو۔

مولانا مرحوم کی طبیعت شاعرانہ حیثیت کی حامل تھی۔ اس لئے ان کی ہندو کانگریس نوازی سے یہی نہیں بلکہ خود گاندھی جی سے جن کے وہ کسی زمانے میں بڑے عقیدت مند تھے، انجام آخر لڑائی لڑنا ہی پڑی۔ یہ اختلاف عارضی اور وقتی اسباب کی وجہ سے نہ تھا جیسا کہ اس وقت لوگوں نے سمجھا۔ یہ تصادم تھا دو مختلف ذہنیتوں کا۔ ہندو قوم پرست ہندوستان کی قومی تحریک کی قیادت کا دعویدار تھا۔ وہ مسلمانوں کو صرف اپنا پیرو دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ کہ دونوں اس تحریک میں برابر کے ساتھی ہوں یہ خیال گاندھی جی کی اساسی فکر میں کبھی شامل نہیں رہا۔ گاندھی جی قوم آزاد ہندوستان کا سیاسی اور روحانی مسلک بننے کا مدعی ہے۔ گو مسلمانوں کی اس میں گنجائش ہے لیکن محض طفیلی یا ذیلی حیثیت سے۔ ہندوستان کی قومی آزادی کی اس تعبیر کا اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں نکل سکتا کہ مجبوراً جو مسلمان ان حالات میں کانگریس میں جائے گا مسلمان اسے بد بختی قرار دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ عام مسلمانوں کی کانگریس کی موجودہ قیادت سے بیزاری کا اصل سبب جو حقیقت میں یہی ہے کہ گاندھی جی نے قومی وطنیت اور مذہبی سیاست کا جو تصور قائم کر دیا ہے اس میں مسلمان اس میں اپنے لئے باعزت جگہ نہیں پاتا۔ اس سے وہ گاندھی جی کی قیادت کو ماننے سے انکاری ہے اور کانگریس کو ہندو قومی جماعت سمجھتا ہے۔

کو ترقی کے راستے پر ایک قدم اور آگے لے جا سکتا تھا۔

شاہ ولی اللہ اس فکر کے موسس ہیں۔ ان کے جانشینوں نے اپنی ایک جماعت بھی بنالی۔ اس زمانے میں ہندوستان میں بڑی گڑبڑ تھی۔ مختلف قومیں اور جماعتیں اپنے اپنے اقتدار کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ شاہ ولی اللہ کی جماعت کو بھی اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد کرنی پڑی۔ اس جدوجہد نے کئی شکلیں اختیار کیں لیکن اس جماعت کا اصل اصول بطور اپنی اصلی حالت میں رہا اور اس میں کوئی کمی زیادتی نہیں ہوئی۔ شاہ عبدالرحیم دربار کے علماء میں سے نہ تھے۔ ان کے صاحبزادے شاہ ولی اللہ بھی درباری سیاست سے الگ ہی رہے۔ جس سال عالمگیر کے تخت پر سلطان محمد شاہ متمکن ہوا، شاہ ولی اللہ اپنے باپ کی مسند تدریس پر جلوہ افروز ہوئے۔ یہ ۱۱۳۱ھ کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی تھی اور عام پڑھے لکھے مسلمانوں کی زبان فارسی تھی۔ شاہ ولی اللہ کا خطاب عام مسلمانوں سے تھا۔ اس لئے سب سے پہلے انہوں نے قرآن مجید کا عوام مسلمانوں کی زبان میں ترجمہ کرنا ضروری سمجھا۔ شاہ ولی اللہ کے جانشین ان کے بیٹے شاہ عبدالعزیز ہوئے جو ۱۷۶۳ء سے ۱۸۲۴ء تک دہلی میں درس دیتے رہے۔ ان کے زمانے میں فارسی کی جگہ اردو لے رہی تھی۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز کے بھائی شاہ عبدالقادر نے قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کیا اور ان کے بھتیجے شاہ اسمٰعیل نے اردو میں اور دینی کتابیں لکھیں۔ یعنی اس تحریک نے مسلمانوں کے حکمران طبقوں کو اپنا محور نہیں بنایا۔ بلکہ عام مسلمانوں کو اپنا مخاطب بنانا چاہتی تھی اور انہیں کی تنظیم اور جماعت بندی پر اپنے کام کی بنیاد رکھنی ضروری سمجھتی تھی۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ قیصر و کسریٰ کی سی خرابیاں مغلوں کی سلطنت میں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس لئے مصلحت خداوندی یہی ہے کہ اس نظام کو سرے سے توڑ دیا جائے۔ الغرض شاہ ولی اللہ کی تحریک مغلوں کی گرتی ہوئی شاہی عمارت کو تھامنے نہیں اٹھی تھی۔ وہ تو بادشاہی نظام کو فرسودہ اور بے کار ہوتا دیکھ رہے تھے۔ اس کے

بیٹھنے اور باقی رہنے سے وہ مطلق ناامید تھے۔ دراصل ان کی تحریک کا دارومدار عام مسلمانوں پر تھا
وہ ان کے زوال آمادہ اونچے طبقوں کے بجائے عوام کو ہندوستان کی بادشاہت حاصل کرنے کی
دعوت دینی چاہتے تھے۔ شاہ صاحب چاہتے تھے کہ بداخلاق اور نااہل بادشاہوں اور امیروں
کی جگہ عوام مسلمان لیں۔ چنانچہ وہ اور ان کے جانشین شاہ عبدالعزیز سالہا سال تک ان عوام کی
تعلیم و تربیت میں لگے رہے۔ ان کی کتابوں، رسالوں اور وعظ و تدریس کا حاصل یہ تھا کہ سلطنت
تو اب بالقوت جاری رہے۔ اس کے ساتھ بادشاہ، امراء اور وزیر بھی جانے لگے۔ اب تک نظام
سلطنت ان کے بل پر چلتا تھا۔ اب اگر عام مسلمانوں کو ہندوستان میں رہنا
ہے اور جن اعلیٰ افکار اور بلند مقاصد کو اچھے مسلمان فرمانروا اور نیک صوفی ہندوستان میں
قائم رکھے ہوئے تھے، اگر انہیں برابر جاری رکھنا ہے تو اس کے لئے کسی اور اساس کی ضرورت
ہے جس پر ہندوستان کی نئی سوسائٹی کی بنیاد رکھی جا سکے۔

شاہ ولی اللہ نے اس نئے ہندوستان کا تصور پیش کیا۔ شاہ عبدالعزیز نے اس تصور کو
عام مسلمانوں کے لئے عام فہم بنایا، اور ان کی زبان اور ان کے طور طریقوں پر اس تصور کی تلقین
کی۔ شاہ اسمٰعیل اور سید احمد شہید نے اس تصور کے مطابق اپنی ایک جماعت بنائی اور اس جماعت
کو لے کر وہ میدان عمل میں اترے۔ نتیجہ جو کچھ بھی ہوا۔ اور یہ تحریک اس وقت جو کچھ کرنا چاہتی تھی
نہ کر سکی لیکن اس کے اثرات ختم نہ ہو سکے۔ کسی کوشش کے ناکام ہو جانے سے وہ روح جو اس
کوشش کا باعث ہوتی ہے، بےکار تو نہیں ہو جاتی۔ یہ روح اندر ہی اندر اپنا کام کرتی ہے۔ حالات
سازگار نہیں ہوتے تو یہ روح ظاہر میں اپنے اصلی رنگ میں نہیں آتی۔ اس کے لئے کوششیں
ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی یہ کوئی شکل اختیار کرتی ہیں اور کبھی دوسری شکل۔ ان الگ الگ شکلوں سے
یہ سمجھا جاتا ہے کہ سب کوششیں الگ الگ تھیں اور ایک دوسرے سے بےتعلق۔ لیکن سمجھدار
اس کثرت میں ایک ہی وحدت پاتے ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی صاحب کا یہ کہنا کہ مسلمانوں کی موجودہ بیداری کی تحریک سرسید کے
تعلیمی مشن اور محمد علی کی سیاسی جدوجہد سے شروع نہیں ہوئی۔ گو یہ بات انگریزی پڑھے ہوئے

طبقوں کے لئے بہت حد تک ٹھیک ہے لیکن عام مسلمانوں کی بیداری کی تحریک کا سرچشمہ شاہ ولی اللہ
کی تعلیمات، شاہ عبدالعزیز کے وعظ و ارشاد اور شاہ اسمٰعیل اور سید احمد شہید کے جہاد سے پھوٹتا
ہے۔ بدقسمتی سے موجودہ حکومت میں مسلمان انگریزی پڑھے ہوئے طبقوں کو بڑا عروج حاصل ہے۔
ان ہی کی باتیں ہر جگہ سنی جاتی ہیں۔ اخبار، کالج اور سیاسی انجمنیں سب انہی کی ہیں۔ یہ جو کچھ کہتے
ہیں اس کا ہر جگہ چرچا ہوتا ہے۔ ان کے خلاف شاہ ولی اللہ کا نام لینے والے خود شاہ صاحب کے
مقصود اعلیٰ سے ہٹے ہوئے ہیں۔ دوسرے زمانے کی زبان انگریزی اور اردو ہے اور شاہ صاحب کی
تعلیمات تمام کی تمام فارسی اور عربی میں ہیں۔ ضرورت تھی کہ شاہ صاحب کے ماننے والے ان کی
باتیں اس زمانے کے رنگ میں پیش کرتے۔ لیکن یہ ان کے بس کی بات نہیں۔ وہ خود اپنی آنکھیں
بند کئے دوسری دنیا میں رہتے ہیں اور اس زمانے کی ان کو زیادہ خبر نہیں۔

یہ سب باتیں ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی سیاست، اجتماع اور اب تو مذہب کو بھی انگریزی پڑھے
ہوئے طبقوں کے سپرد کر دیا ہے۔ یہ بیشتر متوسط اونچے طبقوں کے لوگ ہیں۔ اور اگر ان میں سے
پیدائشی طور پر کوئی نچلے طبقے سے ہے بھی تو اس کی زندگی کا تمام سارا مقصد یہ ہے کہ اس کا شمار
بھی اونچے طبقوں میں ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ اور ان کی جماعت کے کام عام مسلمانوں کے
ابھار میں کام نہیں آتے۔ قیادت کی باگ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو انگریزی عہد کی پیداوار
ہیں اور ان کا تمام تر سرمایہ فکر اسی دور کا بنا ہوا ہے۔ مولانا سندھی مسلمانوں کی قومی جدوجہد کی تاریخ
سرسید، مولانا محمد علی یا علی گڑھ سے شروع کرنا غلط سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ سب کڑیاں شاہ
ولی اللہ کی تحریک کے سلسلے کی ہیں اور یہ کہ قومی بیداری کی ابتدا سرسید، مولانا محمد علی سے ہوئی ٹھیک
نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شاہ ولی اللہ کی تحریک مرہٹوں اور سکھوں کی طرح ایک
خاص مذہبی فرقے کی تحریک تھی۔ گرو گوبند سنگھ نے سکھوں کو ابھارا اور انہیں ایک قوت بنا
کر مسلمان بادشاہوں سے ٹکر لی۔ اور سیواجی اور پیشواؤں نے مرہٹوں کو منظم کر کے سارے ہندوستان

پر اقتدار جمانے کی کوشش نہیں کی تو کیا اسی طرح شاہ ولی اللہ اور اُن کے جانشینوں نے مسلمانوں کی فرقہ وارانہ تنظیم نہیں کی۔ اگر واقعہ یہی تھے تو مرہٹوں اور سکھوں کی طرح شاہ ولی اللہ کی بھی ایک تحریک تھی جس کا کام صرف عام مسلمانوں کو اٹھانا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس خیال کو صحیح مان لیں تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف تو بہ تو موجود رہا۔ تا اگر عام ہندو ان اور مغلوں پٹھانوں سلطان بادشاہوں کے جھگڑے ہماری تاریخ کا جزو نہیں بنیں گے اگر ہم اپنی قومی بیداری کی ابتداء شاہ ولی اللہ سے کرتے ہیں اور ہندو سیواجی اور گورو گوبند سنگھ کو اپنے قومی ہیرو شمار کرتے ہیں تو آپس کی کشمکش تو برابر قائم رہی اور اس نقطۂ نظر سے یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں میں مل جل کر رہنے اور سیاسی کام کرنے کی کوئی صورت نہ نکلی۔

بظاہر اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے۔ تاریخ کے واقعات کچھ اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ شاہ ولی اللہ کا نام لیتے ہی ایک جماعت ایک متعصب، تنگ خیال اور جنگجو مذہبی رہنما نظر آتا ہے۔ لیکن اگر اس مسئلے کی پوری تحقیق کی جائے تو حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے ہندوستان کی حالت تا حال یہ تھی کہ ملک چھوٹی چھوٹی راجدھانیوں میں بٹا ہوا تھا اور ان میں برابر جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس خانہ جنگی کی وجہ سے ملک میں کوئی مرکزی حکومت جنم نہ پاتی تھی۔ اسی بنا پر باہر کی دنیا میں بھی اس ملک کی کوئی ساکھ نہ تھی۔ مسلمان بادشاہوں نے ان دونوں باتوں کا تدارک کیا۔ آخر کار اکبر اعظم کے عہد حکومت میں مسلمان بادشاہوں کی برسوں کی کوششیں کمال کو پہنچیں اور کابل سے لے کر دکن تک ہندوستان کی ساری قلمرو ایک بادشاہ، ایک قانون اور ایک سیاسی نظام کے ماتحت متحد ہو گئی۔ اور ایشیا کے ملکوں میں ہندوستان کا نام عزت سے لیا جانے لگا۔ اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب کے بعد دہلی کی مرکزی حکومت کمزور ہو گئی۔ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوتے چلے گئے اور مرکزی حکومت کا ضعف بڑھتا نظر آتا تھا چنانچہ مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں، نوابان اودھ اور روہیلوں کی بغاوتیں اسی کا لازمی نتیجہ تھیں۔ لیکن ہماری تاریخ کا یہ قدم تنزل کی طرف نہیں تھا۔ بلکہ [illegible] مسلمان بادشاہوں کی جدوجہد [illegible]

خدا پرستی، دوسرے عدل وانصاف، تیسرے صحت وصفائی اور چوتھے تزکیۂ نفس۔ ان کے نزدیک مذہب کا فرض یہ ہے کہ ان چار صفات تک انسانوں کی رہنمائی کرے۔ گو مذاہب کے طریقے الگ الگ ہیں، لیکن ہر مذہب کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ خدا تک پہنچنے کی راہ لوگوں کو دکھائے۔ اور نیکوکاروں کی پہچان ان کی خدا پرستی ہے نہ کہ رسوم پرستی۔

شاہ صاحب نے معاشی عدم مساوات کی بعض بڑی خرابیاں گنائی ہیں۔ اور شہنشاہیت اور اُس سے پیدا ہونے والے مفاسد کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جس سوسائٹی میں اقتصادی توازن نہ ہو۔ اس میں طرح طرح کے روگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ نہ وہاں عدل وانصاف قائم ہو سکتا ہے اور نہ مذہب اپنا اچھا اثر ڈال سکتا ہے۔ شاہ صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قیصر وکسریٰ نے خدا کی دنیا کو مصیبت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اور قدرت الٰہی مجبور ہوئی تھی کہ اسلام کے ذریعہ اس روگی نظام کو ختم کر دے اسی طرح آج کی حکمران سوسائٹی بھی ان اجتماعی بیماریوں سے کھوکھلی ہو چکی ہے۔ اور ظاہر ہے اس کا خاتمہ بھی یقینی نظر آتا ہے۔ اب مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور امرائے عہد کی دوسری چھوٹی چھوٹی تحریکیں اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک ہوں گی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی تحریک میں بھی اتنی وسعت اور ہمہ گیری نہ تھی کہ وہ ہندوستان کی مرکزیت اور وحدت کو بحال رکھ سکنے کی تدبیر سوچتی۔ شاہ صاحب اپنے موجودہ نظام میں اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب کے زمانے کی مرکزیت اور سلطنت ہند کے اقتدار اعلیٰ کو بحال دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اس طرح سے کہ مطلق العنان بادشاہوں کے بجائے انصاف کی حکومت ہو۔ اور یہ انصاف کرنے والا خواہ ایک امیر ہو یا کئی ایک یا پوری قوم۔ یعنی آجکل کی اصطلاح میں جمہوری حکومت۔ یہ خلاصہ ہے شاہ صاحب کے سیاسی فکر کا۔ اور ہماری رائے میں یہ فکر آج بھی متحدہ ہندوستان کی اساس بن سکتا ہے۔

اب اگر کہا جائے کہ اگر شاہ ولی اللہ کے فکر کا اساس مذہب تھا اور ان کے اجتماعی اور سیاسی نظام میں سارے انسانوں کو بلا تفریق مذہب وملت ایک سے سلوک کا مستحق سمجھا جا سکتا

تھا تو پھر شاہ ولی اللہ کی تحریک نے فرقہ وارانہ حیثیت کیوں اختیار کی۔ بات یہ ہے کہ پنجاب میں سکھوں نے صرف مغلیہ حکومت سے جنگ شروع نہیں کی تھی بلکہ وہ کل مسلمانوں کے خلاف ہو گئے تھے۔ اسی طرح مرہٹوں نے بادشاہی نظام کے زوال کے دور میں صرف امراء کو قتل نہ کیا بلکہ عام مسلمان ان کے مظالم کا نشانہ بنے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ خود اپنی حفاظت کرتے۔ قوموں اور جماعتوں کی زندگی میں یہ منزل بھی آتی ہے جب کہ صرف بقائے ذات کے لئے انہیں اور مجبوراً ہر وقت ہتھیاروں سے لیس رہنا اور تلواریں سنبھالنے کا مشورہ دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی جماعت کا مرہٹوں اور سکھوں کے خلاف معرکہ آرا ہونا نتیجہ تھا ان خاص حالات کا جن سے اس وقت مسلمانوں کو دوچار ہونا پڑا۔ جہاں تک اصل حقیقت کا تعلق ہے شاہ ولی اللہ کی جماعت مغلوں کے تخت و تاج کے لئے نہیں لڑ رہی تھی۔ وہ تو ان عام انسانی اصولوں کو جن پر ان کے نظام کی بنیاد تھی زندہ کرنا چاہتے تھے۔ یہی وہ اصول تھے جن کے ذریعے ہمارے خیال میں ہندوستان تباہی سے نکل سکتا تھا۔ پھر جب انگریزی تسلط نے سکھوں کو توڑا اور مرہٹوں کا راج روز بروز ختم ہو گیا اور زمانے کے ساتھ ہندوستان کے حالات بھی بدل گئے۔ جب دشمنی کے اسباب نہ رہے تو اب پچھلی دشمنیاں بھی بے معنی ہیں۔ ضرورت ہے کہ دلی کے اس خدا پرست فلسفی کے افکار کو از سر نو پڑھا جائے اور ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر میں اس سے ہدایت حاصل کی جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان کے جھگڑوں کا حل شاہ صاحب کے طرز فکر سے ہو سکتا ہے۔

نادر شاہ کی یلغار اور دہلی میں قتل عام، احمد شاہ ابدالی اور معرکۂ پانی پت میں حق کا باطل پر غلبہ، سیاست ہند میں روہیلوں کی شرکت ومساہمت، ایرانی وتورانی امراء کی ریشہ دوانیاں، ہندوستان میں یورپین اقوام کی نمایاں ہوتی ہوئی تنظیمیں، پھر انگریزوں کا بنگال وبہار وغیرہ میں عمل دخل اور اس قسم کے دوسرے انقلابات شاہ صاحب نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

دہلی کی سلطنت جس اضطراب سے گزر رہی تھی، شاہ صاحب اس کو اچھی طرح جانتے تھے۔ بعد میں جب آپ حجاز تشریف لے گئے تو سلطنت عثمانیہ اور دوسری اسلامی حکومتوں کا بھی مطالعہ کرتے رہے۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں "احوال ہند بر ما مخفی نیست کہ آں مولد ومنشأ فقیر است۔ بلاد عرب نیز دیدیم۔ واحوال مردم ولایت از ثقات آنجا شنیدیم" ہند کے حالات ہم سے مخفی نہیں کیونکہ وہ فقیر کا مولد اور وطن ہے۔ نیز بلاد عرب کو میں نے دیکھا ہے اور ولایت کے لوگوں کے احوال قابل اعتماد افراد سے سنے ہیں۔ ظاہر ہے ان واقعات وحوادث سے ان کا متاثر ہونا لازمی امر تھا۔

شاہ صاحب اپنے دور طالب علمی کا ذکر فرماتے ہوئے اپنی کتاب "جزء لطیف" میں لکھتے ہیں۔

"جب میری عمر پانچ سال کی ہوئی تو فقیر مکتب میں داخل ہوا۔ ساتویں برس والد بزرگوار نے نماز پڑھوائی اور روزہ رکھنے کی تلقین فرمائی۔ اسی سال ختنہ کی رسم بھی ادا ہوئی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اسی سال کے آخر میں میں نے قرآن عظیم ختم کیا۔ دس سال کی عمر میں شرح ملا جامی پڑھی اور عام مطالعہ کی راہ میرے لئے کھل گئی۔ چودھویں برس میری شادی کر دی گئی اور اس معاملے میں والد بزرگوار نے بڑی عجلت سے کام لیا۔ پندرہ سال کا تھا کہ میں نے اپنے والد کے دست مبارک پر بیعت کی اور تصوف کے اشغال میں لگ گیا، اور اس میں خاص طور پر نقشبندی مشائخ کے طریق کو اپنا مقصود بنایا۔ اسی سال تفسیر بیضاوی کا ایک حصہ پڑھا۔ اسی سال والد بزرگوار نے وسیع پیمانے پر کھانے کا انتظام کیا اور خواص وعوام کو دعوت دی اور اسی موقع پر مجھے درس دینے کی اجازت دی گئی۔ الغرض اپنی عمر کے پندرھویں سال اپنے ملک کے دستور کے مطابق

قرار دیا ہے۔ اسی کے ساتھ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اہل عصر فقہ کے مختلف اصناف میں بھی اختلاف کرتے ہیں خصوصاً حنفی اور شافعی۔ اور ہر فرقہ اپنے اساتذہ کو ترجیح کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہر فقہی مذہب میں استخراجی مسائل کی کثرت ہو گئی ہے اور حق کا پتہ لگانا مشکل ہو گیا ہے۔ ان حالات میں طبعی طور پر حکیم الامت کو اپنی دعوت تجدید کے ضمن میں ان تمام امور کی اصلاح کی طرف خاص توجہ کرنی پڑی ہے۔

قرآن عظیم کے ترجمے کے سلسلے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

"اس فقیر پر بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ مجھے متعدد بار اپنے والد بزرگوار کے درس قرآن میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ قرآن کے معانی بڑے غور و تدبر کے ساتھ بیان فرماتے۔ آیات کی شان نزول کی وضاحت کرتے اور حل طلب امور کے لئے تفسیروں کی طرف رجوع کیا جاتا۔ اس کی وجہ سے میرے سامنے فتح و کامیابی کا ایک میدان کھل گیا۔ والد بزرگوار کا دستور یہ تھا کہ اپنے رفقاء کے حلقے میں ہر روز تین رکوع سے کم مقدار میں قرآن کی تلاوت کرتے اور اس کے معانی پر غور و خوض فرماتے۔" خود شاہ صاحب نے حج سے واپس آکر پانچ سال کے بعد قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ[1] کیا اور اس کے گیارہ سال بعد پہلی بار اس کی تعلیم شروع کی۔

حکمت عملی سے مراد یہاں مطلق حکمت عملی ہے۔ قرآن عظیم کی حکمت عملی، یہ شاہ صاحب کا اپنا استخراج ہے۔ شاہ صاحب سے بہت پہلے اکبر اعظم کے دور سے ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں حکمت عملی کی طرف خاص توجہ کی جانے لگی تھی۔ ابوالفضل نے اسی حکمت عملی کی اساس پر اکبری نظام کی بنا رکھی تھی اور محمد شاہ کے عہد تک سلطنت کے کاروبار کا مرکزی فکر یہی رہا۔ شاہ صاحب اس حکمت عملی کو قرآن کے تعارف کا ذریعہ بناتے ہیں۔ بات یہ تھی کہ بلاغت کے ذریعہ قرآن کا سمجھنا اور سمجھانا اس سوسائٹی کے لئے ممکن نہ رہا تھا۔ ہوتا یہ کہ بلاغت کے علوم پڑھتے پڑھتے

---

[1] مرزا حیرت دہلوی نے لکھا ہے کہ شاہ ولی اللہ نے قرآن کا ترجمہ کیا۔ اس سے دہلی میں اس قدر شورش برپا ہوئی کہ وہ حج پر جانے کے لئے مجبور ہو گئے۔ موصوف کا یہ بیان ٹھیک نہیں۔

مجبور تھے کہ اعجاز کا معیار کسی دوسری چیز میں ڈھونڈیں۔ اس سے سارا مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔

عبدالرحیم خیاط معتزلی عالم اپنی کتاب "الانتصار" میں لکھتا ہے کہ نظام یعنی ابراہیم بن سیار کی رائے تھی کہ قرآن اپنے اسلوب بیان کی بنا پر اعجاز کی حیثیت نہیں رکھتا۔ لوگ اگر چاہیں تو اس جیسا اسلوب بیان پیش کر سکتے ہیں۔ ابوالعلاء معری نے تو اس باب میں ایک نظریہ "الصرفۃ" کے نام سے پیش کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے خود ہی تو اسے بشر کو معارضۂ قرآن سے روکا ہوا ہے ورنہ انسان ایسا قرآن لا سکتے تھے۔ معجم الادباء میں یاقوت حموی نے اس سلسلے میں نقل کیا ہے کہ ابوالعلاء معری کے نزدیک قرآن اپنی فصاحت میں اعجاز کا حکم نہ رکھتا تھا اور نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن اس شکل میں معجزہ تھا۔ کیونکہ ہر زمانہ بلیغ کی قدرت میں ہے کہ وہ اس جیسا قرآن لا سکے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے روک دیا ہے۔ اس طرح قرآن اپنی فصاحت بلاغت کے اعتبار سے معجزہ بن گیا ہے۔ یاقوت لکھتا ہے کہ اہل کلام اور شیعوں کی ایک جماعت بھی اس طرح کا عقیدہ رکھتی ہے، جن میں بشر المریسی اور مرتضیٰ ابوالقاسم قابل طور پر قابل ذکر ہیں۔

الغرض شاہ صاحب نے قرآن کے اعجاز کو اس کے بتائے ہوئے نظام حیات میں متعین فرمایا۔ اس طرح قرآن کی عملی افادیت ان کے نزدیک اس کا معجزہ ہونا ثابت ہو گیا۔ اب قرآن کے اس نظام حیات سے ہر شخص خواہ وہ عربی ہو یا عجمی، عامی ہو یا عالم، فلسفی ہو یا سادہ مزاج، مستفید ہو سکتا ہے اور اس کے اعجاز کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن اگر قرآن کا اعجاز محض عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کا پابند ہو جاتا تو اس صورت میں معدودے چند افراد کے سوا دوسرے لوگ اس کی اعجازی خوبیوں سے محروم رہتے۔

قرآن کی حکمت عملی کے علاوہ شاہ صاحب کے اصلاحی پروگرام کا دوسرا اصول اقتصادیات میں توازن اور مساوات کی اہمیت واضح کرنا تھا۔ عام طور پر التصوف فلسفۂ اخلاق سے شروع ہوتا ہے تو حیوانی زندگی کے لئے اقتصادی ضروریات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ لیکن انسانیت کے ساتھ اقتصادیات کا جو تعلق ہے، اس پر کسی نے توجہ نہ کی۔ اس کی وجہ سے ہماری سیاست کھوکھلی ہو گئی۔ ہمارے بڑے بڑے خوشامد اور زیادہ با اخلاق صوفیہ سب کے سب اجتماعی سیاست سے دور رہنا اپنا کمال سمجھتے رہے۔ تصوف کی کتابوں کی سب سے بڑی کوتاہی یہی تھی کہ ان کے مدون کرنے والوں نے انسانی اخلاق اور

شاہ صاحب کے نزدیک انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے اقتصادی توازن ایک ضروری امر ہے اور ہر انسانی جماعت کو ایک ایسے اقتصادی نظام کی ضرورت ہے جو اس کی ضروریاتِ زندگی کا کفیل ہو۔ جب لوگوں کو اپنی اقتصادی ضرورتوں سے اطمینان نصیب ہوتا ہے، تو پھر کہیں وہ اپنے خالی وقت میں جو ان کے پاس کسبِ معاش کے بعد بچ رہتا ہے، زندگی کے ان شعبوں کی ترقی اور تہذیب کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں جو انسانیت کا اصل جوہر ہیں۔ لیکن اگر لوگوں کی اقتصادی ضروریات ہی فراہم نہ ہوں اور ان کی وجہ سے ان کی زندگی مضطر کر دی جائے تو انسانیت کے اعلیٰ مقامات کا ان میں حصہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اقتصادی نظام کے درست اور متوازن ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زندگی میں انسانی اجتماع کے اخلاق تکمیل پذیر ہو سکتے ہیں۔

جب انسان کے اخلاق اس دنیا میں سدھر گئے اور تہذیبِ نفس کے ذریعے اس نے اپنے اخلاق کی تکمیل کر لی تو لازمی طور پر موت کے بعد دوسری زندگی میں اس کے لیے قبر اور حشر کی مصیبتیں آسان ہو جائیں گی۔ اخلاق کی تکمیل ہی اسے جنت کا حق دار بنائے گی۔ اس کی آخری ارتقائی منزل یہ ہے کہ انسان اپنے رب کی رؤیت سے بہرہ ور ہو۔ اگر انسانی اجتماع کو ترقی کی اس راہ پر چلانا نبوت کا اصل مقصد سمجھ لیا جائے تو نبوت انسانی زندگی کے لیے ایک فطری چیز بن جاتی ہے۔ نیز جہاں نبوت نہ ہو، وہاں انبیاء کے اتباع یعنی صدیق اور حکیم یہ کام کریں تو اس طرح انسانیت کا مجموعی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحب کے نزدیک اقتصادی توازن کے یہ معنی ہیں۔

قرآنی حکمت عملی اور اقتصادی توازن — یہ دو اصول تھے شاہ صاحب کے مجوزہ اصلاحی پروگرام کے۔ مختصر الفاظ میں اوپر جو لکھا گیا، یہ مراد تھی ان دو اصولوں سے۔ شاہ صاحب اپنے والد بزرگوار کی وفات کے پورے بارہ برس تک ان امور پر برابر غور و خوض کرتے رہے۔ اور دہلی میں جو ہستیاں ان مسائل کے متعلق بحث و نظر کے دوران جو مواقع تھے، ان سے وہ مستفید ہوتے۔ حکیم الہند اپنے اس لائحہ عمل کو ایک مدلل شکل میں اپنی قوم کے اربابِ فکر کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے، اور

---

انسان کی پوری زندگی کی تہذیب اور اصلاح نبوت کا اولین مقصد ہے باقی حاشیہ صفحہ ۳۵ پر

(۱۱۴۴ھ) کو مکہ معظمہ میں ایک الہامی خواب دیکھا، اس کا حاصل ہم اپنی زبان میں تحریر کرتے ہیں۔

(۱) انہیں یقین دلایا گیا کہ ان کے ذریعہ موجودہ مفاسد کا تدارک ہوگا۔ یعنی وہ ان خرابیوں کو دور کرنے میں ایک مستقل ذمہ دار حیثیت کے مالک ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی انقلابی تعلیمات ایک مستقل حکومت جدیدہ کا باعث اور موجب بنیں گی۔

(۲) انہیں بتایا گیا کہ پہلا نظام توڑ کر اس کی جگہ وہ نیا نظام قائم کرنے کا ذریعہ بنیں گے۔ یعنی وہ ہندوستانی مسلمانوں کے تمام دینی علوم اور سیاسی اور اجتماعی تحریکات میں مستقل امام وقت ہوں گے۔

(۳) انہیں سمجھایا گیا کہ ان کی اصلاحات نافذ کرنے کے لئے باہمی لڑائیوں کا ایک طویل سلسلہ پیش آنے والا ہے۔

مختصر اس سارے خواب کا حاصل یہ نکلا کہ حکیم الہند اسلامی ہندوستان میں ایک مکمل اجتماعی انقلاب کے شروع کرنے والے ہوں گے۔

اس عزم کے ساتھ شاہ صاحب دہلی واپس آگئے۔ سب سے پہلے آپ نے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ فتح الرحمان مکمل کیا جس میں اجمالی طور پر اپنے پروگرام کو درج کر دیا۔ اور ۱۱۵۱ھ (۱۷۳۸ء) میں اس کی تدریس بھی شروع کر دی۔ شاہ صاحب کے اجمالی پروگرام کو سمجھنے کے لئے ان کے ترجمۂ قرآن کے حواشی سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ شاہ صاحب نے فتح الرحمان کے حواشی میں وہ تمام چیزیں درج کر

---

(الف) جس طرح فقہ میں بعض مجتہد منتسب کا درجہ رکھتے ہیں۔ یعنی وہ مستقل مجتہد کے تابع ہوتے ہیں اسی طرح بعض حکومتیں بھی پہلے خاندان شاہی کی تابع ہو کر منتسب کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ اس کے بالمقابل مجتہد مستقل کی طرح اصل انسانیت پر غور کر کے نئے اصول و ضوابط پر حکومت بنتی ہے۔ اس کو حقیقی مستقل حکومت کہنا چاہیے۔ شاہ صاحب کی علمی تحریک در اصل اس امر کی مقتضی تھی کہ ایسی حکومت پیدا کی جائے جس کو خلافت راشدہ کے سوا کسی دوسرے انتساب نہ ہو۔ (ب) قرآن کریم کا فارسی ترجمہ ہندوستان میں سب سے پہلے ملک العلماء شہاب الدین ہندی دولت آبادی متوفی ۸۴۹ھ نے اپنی تفسیر بحر مواج

باقی حاشیہ صفحہ ۴۰ پر

شاہ صاحب نے اسی نظام کلی کی تقلید میں اپنی انقلابی تحریک کو چلایا۔ انہوں نے تصوف کے خاص طریقہ کی بیعت کو اپنے سیاسی نظام کا اساس بنایا۔ دوسرے لفظوں میں طریقت کی بیعت کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ بیعت کرنے والے نے جماعت کا سیاسی نظام تسلیم کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی سیاست میں تصوف کو اتنا بلند دینی درجہ دیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب تک حکومت کو چلانے کی استعداد پیدا نہ ہو، کوئی شخص لڑ کر نیا نظام حکومت قائم نہیں کر سکتا۔ بے شک وہ لڑائی کے ذریعہ پچھلی حکومت کو تباہ تو کر سکتا ہے، لیکن جب تک تربیت یافتہ آدمی اسے میسر نہ آئیں، وہ نئی حکومت چلا نہیں سکتا۔ اور اس قسم کی تربیت اور استعداد صرف عدم تشدد کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ ہر نئی تحریک کو شروع میں اپنا پیغام دوسروں کو سنانے اور ان کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے عدم تشدد پر ہی عامل رہنا پڑتا ہے۔ شاہ صاحب نے اسی اصول پر اپنی جماعت تیار کرنا شروع کی، وہ اس میں کامیاب ہوئے۔ ان کے بعد اُن کے جانشین شاہ عبدالعزیز نے نظام حکومت چلانے کے لئے آدمی بھی تیار کر دیئے۔

بے شک اس زمانے میں ایسے باخبر لوگ موجود تھے جنہیں اس انقلابی تحریک کا احساس ہوا۔ انہوں نے عوام میں شورش پھیلا کر مسجد فتح پوری سے نکلتے وقت حکیم الہند پر حملہ کرا دیا۔

امام ولی اللہ نے اپنے اس فکر کی اشاعت اور تعلیم کی غرض سے جیسی کتابیں لکھیں، وہ سب اہلِ علم کی علمی زبان عربی اور عام پڑھے لکھوں کی زبان یعنی فارسی میں تھیں۔ ان کتابوں میں حکیم الہند نے اپنی دعوت کے اصول اور مسائل ضبط کر دیئے۔ لیکن اس معاملہ میں اتنا التزام فرمایا کہ ان امور کو ایک جگہ قلمبند نہ کیا بلکہ ان کو اپنی تصانیف میں ادھر ادھر پھیلا کر بیان کر دیا۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ نااہل لوگوں کی دست برد سے محفوظ رہیں۔

شاہ صاحب کے پروگرام کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لئے یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ امام ولی اللہ کی حیثیت اُمت محمدیہ میں ایک عظیم الشان صدیق اور حکیم کی ہے۔ اس طرز فکر کے ارباب کمال انبیاء کی طرح تمام انسانیت کو اپنا مخاطب بناتے ہیں، گو بظاہر ان کی دعوت اپنی قوم کے لئے ہوتی ہے۔ امام ولی اللہ کی کتابیں غور سے پڑھی جائیں تو صاف نظر آئے گا کہ ان کی زبان اگرچہ عربی کی

سے مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے ارتفاق (اجتماعی ادارے) کی تشکیل کرے۔ یہ پہلا درجہ ہے۔

دوسرے درجہ میں تجربی علوم اور صحیح اخلاق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔"

اس سے زیادہ تفصیل، بدور بازغہ کے تیسرے مقالہ کے شروع میں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"تمہیں جاننا چاہیے کہ جو تمام ارتفاقات (اجتماعی ادارے) جن پر انسانی نظام تمدن کی عمارت کھڑی ہے، اور کل کے کل اقترابات (خدا تک پہنچنے کے وسائل) جو انسانوں کی فطرت میں ودیعت کئے گئے ہیں مثلاً احسان، عبادات، برائیوں سے اجتناب وغیرہ وغیرہ، یہ ایسے امور ہیں جو مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان کے قواعد کلیہ تو ایک ہی ہیں، لیکن ان کی صورتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ ان میں سے مثال کے طور پر ہم نکاح کو لیتے ہیں جس نے نکاح کے معاملے میں صرف اعلان اور ڈھول بجانے اور دفنا پر اکتفا کیا تو اس نے حق واجب ادا کر دیا۔ اسی طرح جس نے نکاح کے لیے گواہ اور ایجاب و قبول کو ضروری ٹھہرایا، اس نے بھی نکاح کا فرض پورا کر دیا۔ کیونکہ نکاح کا اصل مقصود تو یہ ہے کہ ایک عورت کا اس طرح تعین کر دیا جائے کہ اس میں ایک مرد کے سوا کوئی دوسرا دخیل نہ ہو سکے۔ اور یہی ہر دو صورتوں میں حاصل مراد یہی ہے۔

"یہی حال تقرب الی اللہ کا ہے۔ کبھی تو اس منزل تک انسان یوں پہنچتا ہے کہ وہ انسانی قوام کا جامہ اتار کر خدا کی ذات میں اپنے آپ کو گم کر دے۔ تقرب الی اللہ کا ایک راستہ یہ ہے کہ اپنے اعضا و جوارح کی صحیح تربیت کی جائے۔ اور انسانی نوامیس کے دائرہ میں رہتے ہوئے اللہ سے تقرب چاہا جائے۔ اسی پر ان تمام چھوٹے بڑے مسائل کا قیاس کر لو، جو ارتفاقات اور اقترابات کے سلسلے میں ہم نے بیان کئے ہیں اور بتایا ہے کہ ان کی شکلیں اور صورتیں مختلف ہو سکتی ہیں۔

"اس سے پہلے ملت حنیفی کے نقطہ نظر سے ہم ارتفاقات اور اقترابات کی بہت سی شکلیں بیان کر آئے ہیں۔ تم کہیں اس کی وجہ سے غلطی میں نہ پڑ جانا۔ ان کا ذکر محض مثال کے طور پر تھا۔ اس سے زیادہ اس ذکر سے ہمارا کوئی اور مقصد نہ تھا۔ پھر یہ بھی نہ سمجھ لینا کہ اصل حقیقت ارتفاقات

نے نیا جنم لیا۔ نیز ادب و نثر میں سرسید، نذیر احمد، ذکاء اللہ اور شعر و نظم میں غالب، حالی، داغ دہلی کی اسی عظمتِ رفتہ کی یادگاریں تھیں جن کے فیض سے جلی ہوئی کھیتیوں کو پھر لہلہانے کا موقع ملا۔

بے شک محمد شاہ کے دور میں دہلی کی سیاسی حیثیت سلطنت کے عام زوال کی وجہ سے بہت گر چکی تھی لیکن ذہنی اور فکری اعتبار سے دہلی کو ابھی گہن لگنا شروع نہیں ہوا تھا۔ امام ولی اللہ نے اسی دہلی کے اربابِ فکر کو اپنی دعوت کا مخاطب بنایا تھا اور وہ دہلی کے اعلیٰ طبقہ کو متاثر کرنے میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو گئے۔ اس کے لیے دو تاریخی شہادتیں کافی ہیں۔ مرزا مظہر جانجاناں فرماتے ہیں "حضرت شاہ ولی اللہ محدث رحمۃ اللہ علیہ نے نیا طریقہ بیان فرمایا ہے اور اسرار معارف اور علوم کی گہرائیوں کی تحقیق میں ان کی اپنی خاص طرز ہے۔ موصوف ان علوم و کمالات کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ علمائے ربّانی میں سے ہیں۔ وہ ایسے محقق صوفی کہ جو ظاہر و باطن کے علوم کے جامع ہوں اور انہوں نے نئے علوم بھی بیان کئے ہوں، عہد گزشتہ میں بہت کم گزرے ہیں۔"[الف]

شاہ ولی اللہ کی دعوت کی مقبولیت کی دوسری شہادت محمد شاہ کے دربار کا فیصلہ ہے۔ محمد شاہ امام ولی اللہ کے مدرسہ کو پرانی دہلی کے اس چھوٹے احاطہ میں دیکھنا نہیں چاہتے، بلکہ وہ شاہجہان آباد کا ایک پورا محلہ اس کے لیے خاص کر دیتے ہیں یہی مدرسہ[ب] آگے چل کر ولی اللہی تحریک کا مرکز بنتا ہے۔ امام ولی اللہ، ان کے بعد امام عبدالعزیزؒ اور پھر امام محمد اسحاقؒ نے اسی مدرسہ میں بیٹھ کر اس تحریک کی رہنمائی کی جس کے پیش نظر سلطنتِ دہلی کی تجدید تھی۔ اسی مدرسہ کے نمونے پر غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ولی اللہی تحریک کے دوسرے دور میں مدرسہ دیوبند[ج] بنایا گیا۔

حکیم الہند نے اپنے پروگرام کی تدوین کے ساتھ ساتھ رفقاء کی مرکزی جماعت بھی تیار کی جو تعلیم و ارشاد کے ذریعہ اس انقلابی تحریک کی اشاعت ایک طرف صوفیہ اور علماء میں اور دوسری طرف امراء و سرداران سلطنت میں کرتی رہی۔ ان میں سے مولانا محمد عاشق پھلتیؒ، مولانا نور اللہ بڈھانویؒ اور مولانا محمد امین کشمیری خاص طور پر مشہور رہے ہیں۔ نیز آپ نے اطراف ملک میں اس مرکزی جمعیت کی شاخیں قائم

---

الف کلمات طیبات صفحہ ۱۶۴، ۱۶۵ ب، ج تفصیل بعد میں آئے گی

کرنال، نجیب آباد کا مدرسہ اور رائے بریلی میں دائرہ (تکیہ) شاہ علم اللہؒ حکیم الہند کی مرکزی تحریک کے مرکز تھے۔ سندھ میں ٹھٹھ کے مخدوم معینؒ کا مدرسہ محمدیہ بھی ان کا ایک مرکز تھا، جس سے مشہور عارف شاہ عبداللطیف بھٹائی خصوصی تعلق رکھتے ہیں۔

ہم شاہ صاحب کے الہامی خواب کا، جو آپ نے مکہ معظمہ میں ۱۱۴۴ھ میں دیکھا تھا، پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اس خواب میں حکیم الہند نے دیکھا تھا کہ ملک الکفار مسلمانوں کے شہروں پر قابض ہو گیا ہے۔ اس خواب کا مشاہدہ بعد میں شاہ صاحب کو یوں کرایا گیا کہ لال قلعہ پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا۔ پھر آپ نے خواب میں یہ بھی دیکھا تھا کہ میں قائم الزمان ہوں، یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک ذریعہ بنایا گیا ہوں۔ تیس سال بعد ۱۱۷۴ھ میں معرکہ پانی پتؒ میں اس خواب کی تعبیر سامنے آئی۔ نواب نجیب الدولہ شاہ ولی اللہ کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے اور شاہ صاحب ہی کے مشورہ پر انہوں نے اور ان کے رفقاء نے احمد شاہ ابدالی کو بلایا تھا۔ اس طرح شاہ صاحب نے دہلی کی حکومت کے انتزاع سے اپنے پروگرام کا ایک حصہ مکمل کر لیا۔ چنانچہ پانی پت میں احمد شاہ ابدالی کی کامیابی نے دہلی کے پاس ماحول کو مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے خطرات سے محفوظ کر دیا۔ اس واقعہ کے دو برس بعد ۱۱۷۶ھ یعنی ۱۷۶۲ء میں امام ولی اللہ نے وفات پائی۔

ہمارے اہل علم حکیم الہند کی تصانیف اگر غور سے پڑھیں تو ان پر شاہ صاحب کے مخصوص نظریات واضح ہو جائیں گے۔ شاہ صاحب کے وہ افکار جو پہلی ہی نظر میں ان کی تصانیف میں سے آشکارا ہو جاتے ہیں، ان میں سے نمونے کے طور پر پانچ کا بیان ذکر کرتے ہیں۔

(۱) قرآن عظیم ایک انقلاب آفریں نظام کی دعوت دیتا ہے۔ یہ انقلاب آفریں نظام بین الاقوامی اور عالمی انسانیت پر شامل ہے۔ وہ یعنی دنیا تک جب بھی مسلمانوں کی کوئی جماعت اس پر عمل کرے گی تو اس سے وہی نتائج پیدا ہوں گے جو تاریخ اسلام کے دور اوّل یعنی خلافت راشدہ میں دنیا نے دیکھے۔ یہ قرآن کی تاثیر ہے۔ کسی آدمی یا زمانے کی تخصیص نہیں ہے۔

ہمیشہ قرآن کی اس تاثیر کو عام نظروں سے اوجھل کرنے کے لئے بار بار کوشش ہوتی رہی ہے۔

مصر کے مشہور عیسائی مؤرخ اور مصنف جرجی زیدان نے تو صاف صاف لکھ دیا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی خلافت کا نظام محض بخت و اتفاق کا نتیجہ تھا۔ یعنی عہد گذشتہ میں اسلام کے عظیم الشان انقلاب کا باعث قرآن کی تعلیمات نہ تھیں، اتفاق سے چند افراد ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے ایک بار یہ کر دکھایا۔ لیکن یہ کر ہمیشہ یہیں ہو غلط ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کے دور رس انقلابی اثرات کو زائل کرنے کے لیے اور بھی حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔

زمانہ حال میں مجالس ہائے سیرت کا نظام بھی اسی قسم کا ایک خواب آور نشہ ہے جو عوام مسلمانوں کو پلایا جا رہا ہے۔ تحریک چلانے والے یہ سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر جن لوگوں نے ان کو یہ نقطہ دیا ہے ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے دماغوں میں یہ خیال جما لیں کہ اسلام کی تمام اثر آفرینی قرآن کے بجائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے نظیر شخصیت میں مضمر ہے۔ اگر آئندہ بھی کوئی ایسی شخصیت بروئے کار آ گئی تو ممکن ہے کہ یہ اثر دوبارہ پیدا ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت انتظار مہدی میں بیٹھی ہے۔

(۴) قرآن کی تعلیمات کے اثر سے مسلمانوں میں جو اجتماعی تحریک عالم وجود میں آئی وہ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت سے شروع ہو کر حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں شورش کے زمانہ تک عرصہ اپنی اصلی حالت میں جاری رہی۔ قرآن حکیم کی عملی تفسیر کے طور پر اس اجتماعی تحریک کو جو سامنے رکھی گئی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے۔ اسی شہر میں اسلام کی اجتماعی تحریک نے ایک مستقل نظام کی شکل اختیار کی۔ آپ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے دور میں مدینہ ہی اسلام کی تحریک کا مرکز و منبع بنا رہا۔ بعد میں جب مسلمانوں میں خانہ جنگیاں شروع ہوئیں تو حضرت علیؓ نے مدینہ کے بجائے کوفہ کو اپنا سیاسی مرکز بنایا اور ان کے بعد امویوں نے دمشق میں اپنا دار الخلافت منتقل کر دیا۔ تو پھر بھی اسلام کی دینی اور فکری مرکزیت مدینہ ہی میں رہی۔ یہی وجہ تھی کہ قرآن کے اثر و تاثیر سے جو نظام اجتماع معرض وجود میں آیا اس کے اساسی مبادی اور تعلیمات اہل مدینہ کے ہاں محفوظ رہیں۔ بعد میں ان کو امام مالک نے اپنی کتاب مؤطا میں مدون کر دیا۔ اس لئے امام مالک کی مؤطا کو حدیث و فقہ کی تمام کتابوں پر مقدم مانا جاتا ہے۔

انقطاع مسلمانوں میں دینی تعلیم اجتماعی طور پر مدینہ منورہ سے پھیلنا شروع ہوئی باقی حاشیہ صفحہ ۲۰ پر

کے لئے ضروری ہے کہ سیرت رسول عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شرفائے قریش کے وہ خاندان جو مہاجرین ہونے کا شرف حاصل کر چکے ہیں وہ ان کی ذہنیت، ان کی معاشی حالت اور ان کی معاشرتی سیرت کو اپنا امام بنائے۔

مسلمانوں میں اس انقلابی روح کو پیدا کرنے کے لئے حکیم الہند عربی زبان اور عرب[1] اول کی سیرت کو ایک معیار قرار دیتے ہیں۔ اس سے ان کا یہ مطلب نہیں کہ اگر عرب جاہلیت کو زندہ کرتے ہوں تو اس صورت میں بھی انہیں کی تقلید کی جائے۔

حکیم الہند کے اس چوتھے اصول کو کہ کسی سوسائٹی میں عدل و انصاف پیدا نہیں ہو سکتا جب تک رزق کمانے والی جماعتوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے سے احتراز کلی نہ برتا جائے، ہم اس وقت تک نہیں سمجھ سکے جب تک ہم نے یورپ میں جا کر سوشلزم کا مطالعہ نہیں کر لیا۔ جن رفقاء نے ہمیں اس مطالعہ میں مدد دی، وہ سب کارل مارکس کے متبع تھے۔ اس کے احترام میں ہمارے یہ رفقاء اس قدر مبالغہ کرتے جس سے ہمیں تکلیف ہوتی۔ اس احترام اور ذہنیت کا مرکز وہ کارل مارکس کے اقتصادی نظام کو بتاتے ہیں۔ ہم حیران رہ گئے جب اس قسم کے انقلابی پروگرام کے تمام حصے ہم نے حکیم الہند کی

---

[1] عرب قوم کا اتباع اور چیز ہے۔ اور عرب اول کے انقلابی طبقہ کا اتباع بالکل دوسری چیز ہے۔ انقلاب پیدا کرنے کے لیے انقلابی سیرت سامنے رکھنی چاہئے۔ قریش میں سے مہاجرین کا طبقہ اپنے شہر کا حاکم تھا۔ انہوں نے گھر بار چھوڑا، اپنی حکومت کو خیرباد کہا، پردیس میں جا کر اپنی محنت سے نئے گھر بنائے۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ قرآن کے انقلاب کو کامیاب بنا سکیں۔ مہاجرین کی یہ سیرت قرآن سمجھنے کے لئے صحیح ہدایت بن سکتی ہے لیکن ایک شخص اپنے گھر کا دلدادہ ہے اور چاہتا ہے کہ قرآن بھی سمجھ لے۔ ایں خیال است و محال است و جنوں۔

ہم نے جب یورپ کے انقلابیوں کی اولوالعزمی دیکھی تو ہمیں اس کے مقابلے میں اپنی قوم کی ذہنی پستی کو دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا مگر ہم اپنے نوجوانوں سے مایوس نہیں ہیں۔ البتہ حیران ہیں کہ کاش ہم کوئی رہنمائی دے سکتے۔[2] کارل مارکس جرمنی میں ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۸۳ء میں اس نے وفات پائی۔ اس کا اشتراکی مینی فیسٹو

" بقیہ حاشیہ آگے "

تصانیف میں جو کارل مارکس سے بہت پہلے گزرے ہیں نہایت بسط سے مدون پائے۔ امام ولی اللہ ۱۷۶۲ء میں فوت ہوئے اور کارل مارکس ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا۔

---

بقیہ حاشیہ: ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا۔ اور اس کی قائم کردہ پہلی انٹرنیشنل کا اجلاس ۱۸۶۴ء میں منعقد ہوا جس میں اس کے پروگرام کو پہلی مرتبہ متعارف کرایا گیا۔ اس حساب سے شاہ ولی اللہ صاحب پہلی انٹرنیشنل سے ۱۰۰ سال پیشتر اور مارکس کے اعلان اشتراکیت کی اشاعت سے ۸۶ سال پیشتر وصال فرما چکے تھے۔

# سراج الہند امام عبدالعزیز

## ۱۱۷۶ھ ——— ۱۲۳۹ھ

جب حکیم مجتہد امام ولی اللہ فوت ہوئے تو شاہ عبدالعزیز اس وقت سترہ برس کے نوجوان تھے اور ابھی جانب علوم سے فارغ نہیں ہوئے تھے۔ امام ولی اللہ کی مرکزی جمعیت نے شاہ عبدالعزیز ہی کو حزب ولی اللہ کا امام بنانے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے امام ولی اللہ کے طریقہ پر شاہ عبدالعزیز کی علمی تکمیل کی طرف توجہ کی گئی۔ مولانا محمد عاشق اور مولانا محمد امین نے علم حدیث اور ولی اللہی انقلابی تحریک کے اصولوں میں اور مولانا نور اللہ جو مولانا عبدالعزیز کے خسر بھی تھے فقہ میں ان کی علمی تربیت مکمل کی اور انہیں امام عبدالعزیز کے درجہ تک پہنچا دیا۔

مولانا محمد عاشق، مولانا محمد امین کشمیری اور مولانا نور اللہ بڈھانوی تینوں امام ولی اللہ کے تربیت یافتہ مخصوص اصحاب کی جماعت کے سرکردہ بزرگ تھے۔ ان کے ذریعہ شاہ ولی اللہ صاحب کے علوم محفوظ ہوئے اور پھیلے۔ ان کے ساتھ ساتھ شاہ ولی اللہ صاحب کے شاگردوں کا ایک دوسرا طبقہ بھی پیدا ہوا، جس میں ان کی اولاد بھی داخل ہے۔ امام عبدالعزیز اس دوسرے طبقہ کے مقتدر امام ہیں۔ شاہ ولی اللہ کے خواص شاگردوں سے اگر چند آدمیوں نے استفادہ کیا تو

شاہ عبدالعزیز کے خواص شاگردوں سے دس ہزار مستفید ہوئے۔ شاہ ولی اللہ کے زمانے میں تو دہلی کی اسلامی عظمت میں ایک حد تک ابھی جان باقی تھی، لیکن شاہ عبدالعزیز کے عہد میں تو رہی سہی جان بھی ختم ہو گئی۔ اس وقت خاص دہلی میں انگریزی ریزیڈنٹ موجود تھا۔ اور ظاہر ہے انگریزی حکومت شاہ ولی اللہ، ان کے علوم اور ان علوم سے آگے چل کر جو نتائج مرتب ہو سکنے کا امکان تھا، ان سے ناواقف نہ تھی۔ لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے شاہ ولی اللہ کے علوم کو جس طرح بھی ہو سکا، عام اہل علم تک پہنچا دیا۔

امام عبدالعزیز نے یہ کیا کہ ان کے زمانے میں عام علماء جن علوم سے زیادہ مانوس تھے، موصوف نے خود بھی ان علوم میں خاص دلچسپی لی۔ آپ مروجہ درسی کتابوں میں جو اقوال شاہ ولی اللہ کی تحقیق کے خلاف پاتے، ان پر بڑی لطافت سے بتدریج جرح کرتے جاتے اور آخر میں بہت ہلکے الفاظ میں شاہ ولی اللہ کا قول نقل کر دیتے۔ اس طرح ولی اللہی فکر آسانی سے دماغ میں جذب ہو جاتا۔ لیکن آپ اس قول کو نہ اپنی طرف منسوب کرتے اور نہ شاہ ولی اللہ کی طرف۔ اس طرح آپ عام اہل علم میں اتنی استعداد پیدا کر دیتے کہ وہ امام ولی اللہ کی تحقیقات کو سمجھ سکیں۔ اس کی مثالیں آپ کی تصنیف "تحفہ اثنا عشریہ" اور "تفسیر عزیزی" میں کثرت سے ملتی ہیں۔ لیکن اپنے خواص اہل بیت کو اور جو اور بھی ان کے زمرہ میں شریک ہو سکا، آپ نے خاص طور پر شاہ ولی اللہ کی کتابوں کا محقق بنا دیا۔ اس طرح امام عبدالعزیز نے کم از کم ساٹھ برس تک کام کیا۔ یہاں تک کہ شاہ ولی اللہ کا علم اور ان کی حکمت لوگوں کے ذہنوں میں راسخ ہو گئی۔ اگر اس وقت یورپ کی ایک بڑی عقل مند انقلابی حکومت ہندوستان میں پاؤں نہ جما چکی ہوتی تو شاہ عبدالعزیز کے علوم کا آج یہاں اقتدار ہوتا۔ لیکن یہ یورپی حکومت صرف شاہ عبدالعزیز کے علوم سے جنگ ہار جانے میں تیار ثابت نہ ہوئی بلکہ اس کی تدبیروں نے ان علوم کی صورت کو اس طرح مسخ کیا کہ عوام ان سے متنفر ہو گئے۔ البتہ جن لوگوں میں علمی ذوق موجود تھا، وہ اس مخالف پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہوئے۔

شاہ عبدالعزیز نے ایک طرف تو حکیم الہند کے علوم و حقائق کی اشاعت کی۔ دوسری طرف

ان کا مقصد حیات یہ بھی تھا کہ شاہ ولی اللہ کی انقلابی دعوت کو ہندوستان میں عملی جامہ پہنائیں۔ شاہ ولی اللہ کو الہام کیا گیا تھا کہ جو چیزیں تمہیں دینے کا وعدہ کیا گیا ہے ان کے لیے کافی صبر کی ضرورت ہے۔ اس کام کو پورا کرنا شاہ عبد العزیز کا مقصد تھا۔ شاہ عبد العزیز کے ساتھ ان کے اپنے بھائی شاہ رفیع الدین اور شاہ عبد القادر بہترین مددگار ثابت ہوئے۔ عقلی مسائل کے لیے جس قدر تحقیق کی ضرورت ہوتی، اس کو شاہ رفیع الدین پورا کرتے تھے۔ کشفی مسائل میں خصوصیت کے ساتھ شاہ عبد القادر ممتاز تھے۔ نقلی علوم کی تعلیم شاہ عبد العزیز کے اپنے ذمہ تھی۔ اس طرح علم کے تینوں ذرائع یعنی عقل، نقل اور کشف کی مدد سے ایک جامع سوسائٹی پیدا کرنے کی کوشش جاری رہی۔

اسی زمانے میں امام عبد العزیز نے امام انقلاب امیر المومنین علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کو خواب میں دیکھا۔ امیر المومنین نے انہیں یقین دلایا کہ عام طور پر فقہا اور صوفیہ کے مروجہ طریقے افراط و تفریط سے خالی نہیں۔ لیکن قرون اولیٰ کے مطابق صرف وہی طریقہ ہے جس کی دعوت امام ولی اللہ دیتے ہیں۔ امیر المومنین نے ان کی قلبی کیفیت میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ جسے امام عبد العزیز بیداری میں بھی اپنے اندر محسوس کرتے تھے۔ امیر المومنین نے انہیں فنون جنگ بھی سیکھنے کی طرف توجہ دلائی۔

شاہ عبد العزیز حقیقت میں ولی اللہی تحریک کے سلسلے کے پہلے امام ہیں جنہوں نے حکیم الہند شاہ ولی اللہ کے اصول پر قومی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ شاہ ولی اللہ نے دہلی کے اعلیٰ طبقہ کو اپنے علوم سے متعارف کیا تھا اور امرائے سلطنت کے اشتراک سے کسی قدر سیاسی کامیابی بھی حاصل کر لی تھی۔ یہ بات متحقق ہو چکی ہے کہ نواب نجیب الدولہ شاہ ولی اللہ کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے۔ اور شاہ صاحب ہی کے مشورے سے انہوں نے اور ان کے رفقاء نے احمد شاہ ابدالی کو قندھار سے بلایا تھا۔ اصل میں احمد شاہ ابدالی کو بلانے میں شاہ صاحب کی روحانیت کام

---

؎ تفہیمات صفحہ ۴۳ حصہ دوم کی روح یہ ہے کہ ان کو پشتونوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ اس سے پہلے شاہ ولی اللہ اپنی کتاب [illegible] میں لکھ چکے ہیں کہ حکومت چلانے کی استعداد سلطان ہند سے افغان کی طرف منتقل ہو چکی ہے۔ اس سے ان کی مراد جنگی طاقت اور عملی قوت ہے۔ جس قوم سے لڑنے مرنے کی طاقت سلب کر لی گئی ہو وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔

کر رہی تھی اور نواب نجیب الدولہ اس میں ایک واسطہ تھے۔ لیکن بدقسمتی سے سلطنت دہلی کا نظام اتنا بوسیدہ ہو چکا تھا کہ امرائے حکومت میں سے کوئی بھی اس قابل نہ نکلا جو پانی پت کی فتح سے فائدہ اٹھاتا اور ہندوستان کی اسلامی سلطنت کے مرکز کو انتشار اور تباہی سے بچا لیتا۔ البتہ بعض ارکانِ دولت نے اتنا کر لیا کہ چند صوبوں کی حکومتیں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ چنانچہ ان چند ریاستوں کے سوا ہندوستان کے باقی حصوں پر مسلمانوں کی حکومت برائے نام رہ گئی تھی۔

بے شک احمد شاہ ابدالی کی یلغار سے مرہٹوں کا زور ٹوٹ گیا اور پانی پت میں شکست کھانے کے بعد ان میں اتنی سکت نہ رہی کہ وہ اکبر اور عالمگیر کے تخت کے مالک بننے کی دوبارہ خواہش کر سکتے۔ لیکن اس عرصے میں انگریز بڑی سرعت سے قوت پکڑ رہے تھے۔ انہوں نے بنگال اور مدراس پر قبضہ کرنے کے بعد شمالی ہند کی طرف توجہ کی۔ بکسر کی لڑائی میں جو ۱۷۶۴ء کو ہوئی، شاہ عالم ثانی انگریزوں کے ہاتھ آ گیا۔ بادشاہ نے ان سے معاہدہ کیا جس کی رو سے تمام قلمرو کی نظامت کمپنی کو سپرد کر دی گئی اور بادشاہ کے لئے قلعہ، اطراف دہلی تا حدود قطب صاحب کا علاقہ مخصوص کر دیا گیا۔ کمپنی گویا جاگیردار قرار دی گئی۔ مگر عملاً یہ قرار پایا کہ ملک بادشاہ کا اور حکم انگریز کا۔ مسلمانوں کے لئے خصوصاً اور عام ہندوستانیوں کے لئے عموماً رعایتیں رکھی گئیں۔ مثلاً یہ کہ حکومت کی زبان فارسی رہے گی۔ مسلمانوں کے مقدمات کا قاضی فیصلہ کریں گے اور ہندوؤں کے مقدمات کا پنڈت۔

۱۸۰۶ء میں شاہ عالم فوت ہوا اور اس کی جگہ اکبر ثانی بادشاہ بنا تو انگریزوں نے نئے بادشاہ کے حلقۂ اثر کو اور بھی تنگ کر دیا۔ چنانچہ اس کی حکومت صرف قلعہ دہلی اور حدودِ شہر تک محدود کر دی گئی اور باقی تمام ہندوستان کو کمپنی نے اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس طرح دہلی سے لے کر کلکتہ تک کے علاقوں پر انگریزوں کا ایک لحاظ سے عملی تسلط ہو گیا۔ دہلی سے شمال کی طرف کے جو صوبے تھے وہ ایک زمانہ ہوا ہندوستان کے مرکز سے پہلے ہی کٹ چکے تھے۔ چنانچہ امام ولی اللہؒ کے وقت میں نادر شاہ نے کابل، قندھار اور پشاور کو ایران سے ملحق کر لیا تھا۔ اس سے پہلے قندھار کی افغانی حکومت جو میرویس سے شروع ہوئی تھی، احمد شاہ کو اپنا بادشاہ مانتی تھی۔ نادر شاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے کشمیر اور

اور ملتان کے صُوبے بھی دہلی سے چھین لئے۔ اس طرح یہ چھ صُوبے دہلی کی حکومت سے الگ ہو گئے۔ ہم قندھار کی اس افغانی حکومت کو بھی ہندوستانی حکومت مانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی وہی حیثیت تھی جو نظامِ دکن کی حکومت کی تھی۔[۶]

۱۱۶۱ھ کے قریب احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا۔ لیکن یہ قبضہ زیادہ عرصہ تک نہ رہا۔ ۱۲۱۳ھ میں احمد شاہ کا پوتا زمان شاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اس نے لاہور فتح کیا۔ وُہ دہلی کی طرف کوچ کرنے کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا کہ انگریزی ڈپلومیسی نے اپنا کام کیا اور افغانستان پر ایران کی جانب سے حملہ کرا دیا۔ ناچار شاہ زمان کو لدھیانہ سے واپس کابل کی طرف جانا پڑا۔ اس رواروی میں وُہ رنجیت سنگھ کو پنجاب کا گورنر بنا گیا۔ یہی رنجیت سنگھ ہے جس نے رفتہ رفتہ ۱۸۰۹ء یعنی ۱۲۲۳ھ میں پنجاب، ملتان، کشمیر اور پشاور پر قبضہ کر کے ایک مستقل سکھ حکومت کی بنا ڈالی اور انگریزوں سے مصالحانہ معاہدہ کیا۔

الغرض امام عبد العزیز کے زمانے میں ایک طرف کلکتہ سے لے کر دہلی تک انگریز عمل کے لحاظ سے مسلط ہو چکے تھے۔ دوسری طرف دکن میں مرہٹے اور پنجاب میں سکھ زوروں پر تھے۔ ان کے مقابلے میں لکھنؤ، حیدرآباد اور پھر میسور کی مسلم حکومتیں تھیں جو سلطان دہلی کا احترام کرتی تھیں۔ ہمارے خیال میں شاہ عبد العزیز کے پروگرام کا بھی وہی خاکہ تھا جس پر امام ولی اللہ پہلے عمل کر چکے تھے۔ آپ نے مرہٹوں کے تغلب کو دُور کرنے کے لیے نواب نجیب الدولہ کے ذریعہ احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی تھی۔ اب شاہ عبد العزیز کے عہد میں پنجاب پر سکھ قابض ہو چکے تھے، اور خاص دہلی میں انگریز آگئے تھے۔ شاہ عبد العزیز کے پیشِ نظر یہ تھا کہ وُہ کابل اور قندھار کی طاقت کو دعوت دے کر دہلی بلائیں۔ اگر وہاں کے امراء ناقابل ثابت ہوں تو عام لوگوں میں سے جو لائق افراد میسر آئیں، ان سے مدد لی جائے۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ کابل اور قندھار کے ان نواح میں امارت قائم کی جائے۔ بات دراصل یہ تھی کہ اس زمانے میں ہندوستان کی مسلمان اقوام میں سے صرف افغانوں میں جنگی طاقت اور حربی قوت موجود تھی۔ وُہ ڈنا بھی جانتے تھے اور مردانگی اور شجاعت کے جوہر بھی رکھتے تھے۔ ان کو اگر منظم کر دیا جاتا تو اسلامی قومی حکومت کے لئے ایک مضبوط فوج فراہم ہو سکتی تھی۔

یہ حالات تھے جن میں امام عبدالعزیز نے اپنے آپ کو گھرا ہوا پایا۔ ظاہر ہے ان کو انہی حالات کے مطابق اپنے لئے راہِ عمل نکالنی تھی چنانچہ امام عبدالعزیز نے اپنے کام کو جس خوش تدبیری سے انجام دیا، اس کو دیکھ کر آپ کے کمال کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ مختصر الفاظ میں آپ نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ عام مسلمانوں میں اسلامی عقائد و اخلاق کے متعلق جو غلط فہمیاں رائج ہو چکی تھیں، ان کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائی۔ عملاً اس کا مطلب یہ تھا کہ عوام دوسرے مرشدوں اور عالموں کو چھوڑ کر شاہ صاحب کے گرد جمع ہوتے اور تحریک کی ترقی میں مخالف گروہوں کے لوگ دخل انداز نہ ہو سکتے۔ یہ امام عبدالعزیز کے پروگرام کا پہلا درجہ تھا۔ دوسرا درجہ یہ تھا کہ آپ نے انقلابی دعوتِ عام کے لیے ایک مرکز بنایا جس کے ارکان اسمٰعیل شہید سید احمد شہید اور مولانا عبدالحی تھے اور شاہ محمد اسحاق کو اپنی جگہ مقرر کیا۔ ہماری سمجھ میں اس نئی حزب کے امیر شاہ محمد اسحاق تھے۔ سید احمد شہید امیر الدعوت اور امیر الجہاد تھے۔ امام عبدالعزیز کا اس سے مقصد یہ تھا کہ آگے چل کر یہ جماعت دہلی کی سلطنت کی کمزوری کو دور کرنے کے لیے بروئے کار آسکے۔ یوں کہیے کہ اس جماعت کی حیثیت حکومتِ موقتہ
(PROVISIONAL GOVERNMENT)
کی تھی۔ بظاہر دہلی کی فضا اس کے لیے سازگار نظر نہ آتی تھی، اس لئے لامحالہ اس جماعت کا افغانی علاقہ میں جانا ایک لازمی امر تھا۔ افغانوں میں چونکہ ایک سید کی امارت بہت جلد مقبول ہو سکتی ہے، اس غرض کے پیشِ نظر سید احمد شہید کو امیر جماعت مقرر کیا گیا اور مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحی ان کے وزیر تجویز ہوئے۔

یہ ہے امام عبدالعزیز کے ساٹھ سال کی دعوت و عمل کا ایک مختصر سا خاکہ۔ موصوف نے بتدریج اس کام کو کس طرح چلایا، اب اس کی تفصیلات سنئے۔

امام عبدالعزیز نے سب سے پہلے فتویٰ[۱] دیا کہ ہندوستان کے جس قدر حصے غیر مسلم طاقت کے قبضہ میں جا چکے ہیں ان علاقوں میں اگرچہ برائے نام سلطانِ دہلی کا عمل دخل مانا جاتا ہے، لیکن وہ سب کے سب دار الحرب ہیں۔ امام عبدالعزیز کے نزدیک چونکہ سلطانِ دہلی کی برائے نام حکومت ملک کو دار الاسلام

[۱] اس فتوے کی تفصیل کے لیے فتاویٰ عزیزیہ جلد اول طبع مجتبائی صفحہ ۱۷ و ۱۸۵ ملاحظہ ہو۔

اس کی حیثیت ایک مسلّم امر کی ہے۔

شیعوں کی طرف سے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور ان کی خلافت پر جو اعتراضات ہوتے تھے، ان کے رد میں امام ولی اللہؒ نے اپنی مشہور کتاب "ازالۃ الخفا" لکھی تھی۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے اس کتاب کے مقدمہ کے طور پر کتاب "تحفۂ اثنا عشریہ" تصنیف کی۔ بات یہ تھی کہ شیعوں نے پہلے تو قرآن مجید کی صحیح معرفت اور علم کو امام مہدی کی آمد کے ساتھ مشروط کر دیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے امام مہدی کی آمد کے متعلق عجیب عجیب توہمات کے پردے ڈال دیئے۔ عملی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیعیت کی دعوت مسلمانوں کو قرآن عظیم کی برکات عامہ سے محروم کرنے کا ایک ذریعہ بن گئی۔ ادھر ایرانی حکومت کی مسلسل کوشش سے فرقہ اثنا عشریہ نے امام عبدالعزیز کے زمانے میں شمالی ہند میں اپنا مرکز بنا لیا تھا۔ چنانچہ ان کے مسموم پروپیگنڈے سے متوسط طبقوں کے ذہنوں کو بچانے کے لیے شاہ عبدالعزیز نے کتاب "تحفۂ اثنا عشریہ" لکھی۔ علمائے زمانہ "تحفۂ اثنا عشریہ" کو تو مزے لے لے کر پڑھتے رہے لیکن انہوں نے اسے امام ولی اللہ کی تصنیف "ازالۃ الخفا" کو سمجھنے کا واسطہ نہ بنایا اور اس طرح اس کتاب کے لکھنے کا جو اصل مقصد تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔

تعجب تو اس بات پر ہے کہ یورپ کی قومیں جو پہلے عیسائی تھیں اور آج کل نیچری ہیں۔ قرآن عظیم کے انکار کے باوجود اس کے معارف اور اصولوں سے رہنمائی حاصل کر رہی ہیں۔ اس کے برخلاف مسلمان ہیں کہ قرآن پر کامل ایمان رکھتے ہیں، لیکن یہودیوں کی طرح محض الفاظ کی تلاوت پر اکتفا کر رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے سامنے قرآن کا کوئی واضح پروگرام نہیں رہا اور وہ شیعوں کی طرح کسی بڑے رہنما کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ امام ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کا طریقہ مسلمانوں میں اس مرض کی جڑیں اکھیڑنے کا ضامن ہے۔

امام ولی اللہؒ نے علوم دینی کی تحصیل کے سلسلہ میں امام مالک کی کتاب مؤطا پر بہت زور دیا ہے چنانچہ وہ اپنے وصیت نامہ میں فرماتے ہیں۔

"جب بندہ کو طالب علم عربی زبان سمجھنے کے قابل ہو جائے تو مؤطا امام مالک بروایت یحییٰ بن یحییٰ

کی روایت کے واسطے سے ہم تک پہنچی ہے، مطالعہ کرے۔ نیز چاہیے کہ اس سے معلق سبق تو جہی نہ برتنے کیونکہ علم حدیث کی اصل واساس یہی کتاب ہے اور اس کے پڑھنے میں بڑے فائدے ہیں۔ اس کے بعد وہ قرآن کا مطالعہ کرے اور اس کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ پہلے ترجمہ و تفسیر کے بغیر صرف قرآن پڑھے۔ اور اگر اس میں کوئی نحو یا شانِ نزول کا مسئلہ مشکل نظر آئے تو وہاں رک جائے اور اس پر سوچ بچار کرے۔ جب وہ اس طرح قرآن کے مطالعہ سے فارغ ہو جائے تو پھر تفسیر جلالین پڑھے۔ مطالعہ کا یہ طریقہ بڑا مفید ہے۔"

امام ولی اللہ کے معارف میں مؤطا امام مالک کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ امام ولی اللہ نے اسے اپنے مذاق کے مطابق نئی ترتیب بھی دی اور اس کا نام "المسوّیٰ من المؤطا" رکھا۔ حضرت رفقہ میں امام عبد العزیز نے اپنے والد حکیم ابتدا سے یہی کتاب پڑھی تھی۔ آپ نے خاندان کے فرزندوں کی تربیت میں اسی کتاب کو قرآن عظیم کے بعد اساس بنایا اور اس طرح اپنے زمانے کے علماء کو اس طرف متوجہ کیا۔ امام ولی اللہ کی مرتب کردہ "المسوّیٰ" کو پوری توجہ سے پڑھا جائے، تو نفس ششی میں محققِ مجتہد پیدا ہو سکتے ہیں۔ مؤطا کو اس طرح پڑھنے کی برکت تھی کہ ہم نے اپنی سیاحت میں مولانا شیخ الہند اور ان کے شاگردوں سے زیادہ حقانی علماء اسلامی ممالک میں نہیں دیکھے۔ ہم نے حرم محترم کے علماء کو امام ولی اللہ کی "مسوّیٰ" پڑھائی۔ وہ اس کی قدر کرنے لگے۔ انہوں نے اس کو اپنے مطبع میں چھاپا اور اسے اپنے مدارس کے نصاب میں داخل کیا۔ مجھے یاد ہے کہ حضرت مولانا شیخ الہند ایک زمانہ ہوا امام ولی اللہ کی کتابوں کو دار العلوم دیوبند کے درجہ تکمیل میں داخل کرنے کی ہدایت دے چکے ہیں۔ مگر ابھی تک اس پر عمل نہیں ہوا۔ اِنَّمَا اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْۤ اِلَی اللّٰہِ۔ (میں اپنے رنج و غم کی شکایت صرف اللہ سے کرتا ہوں)۔

---

الفقیہ یعنی مجتہد منتسب جیسے ابن ہمام وغیرہ

درس و تدریس کے اس نصاب کے بعد امام ولی اللہ قریش کی زبان اور اُن کی اعتدال پسند معیشت و معاشرت کو اپنی اولاد میں خاندانی مفاخر کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ وصیت نامہ میں ارشاد ہوتا ہے۔

"ہم مسافر غریب الدیار ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد باہر سے یہاں آکر آباد ہوئے۔ ہمارے لئے عربی نسب اور عربی زبان باعث فخر ہے۔ کیونکہ یہ دونوں ہمیں سید الاولین والآخرین افضل انبیاء و مرسلین فخر موجودات علیہ وعلیٰ آلہ الصلوات والتسلیمات سے نزدیک کرتی ہیں۔ اس نعمت عظمیٰ کا شکر یوں ادا کرنا چاہئے کہ جہاں تک ہوسکے، ان عادات و رسوم کو جو عرب اول کے ساتھ مخصوص تھیں۔ اور یہی دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء و مقصود بھی تھا، ہم ہاتھ سے جانے نہ دیں اور رسوم عجم و عادات ہنود کو اپنے اندر نہ آنے دیں"

امام ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں قیصر و کسریٰ کے تعیشات اور تکلفات کی بڑی مذمت کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محمدی یعنی طریقہ کو ان خرابیوں کا برباد کرنے والا بتایا ہے۔ اسی لئے شاہ ولی اللہ اپنی اولاد کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہیں کہ قرآن کے انقلاب کو دوبارہ دیگر وجود میں لانے کے لئے ضرورت ہے کہ معیشت اور معاشرت میں وہ اخلاق و اوصاف پیدا کئے جائیں۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے تھے۔

امام عبدالعزیز نے اپنے والد کی اس وصیت پر عمل کرتے ہوئے اُس عہد کی سرمایہ داری اور اس کی ترقی یافتہ صورت یعنی شہنشاہی کی لعنتوں کو اس طرح بے نقاب کیا کہ شرفاء کے ایک صالح گروہ کے لیے ان کی خرابیوں کا سمجھنا مشکل نہ رہا۔ پھر امام عبدالعزیز کے تربیت یافتہ نوجوان سوسائٹی کو ان رسموں سے پاک کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے جو جہانگیر اور شاہجہان کے عہد اقبال کی یادگار کے طور پر چلی آتی تھیں۔ اب جبکہ سلطنت و اقبال کبھی کے رخصت ہوچکے تھے اور افلاس کا دور دورہ تھا، یہ رسمیں اعلیٰ خاندانوں کی ہمت کو گھن کی طرح کھا رہی تھیں۔[الف] ان نوجوانوں نے اس کام کو

---

[الف] انسان اگر اپنی معاشی ضرورتوں میں لگا رہے تو اس کا دماغ فراغت سے کوئی اعلیٰ فکر نہیں سوچ سکتا۔ اس (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جو صوبہ بہار کے ناظم و رئیس تھے۔ آپ تنا کے رئیسزادے تھے۔ ہر وقت ریشمی یا زریں لباس یا ڈھاکہ کی جامدانی اور تن زیب کا جوڑا زیب تن رہتا تھا۔ اور خوشبو و عطر سے معطر رہتے تھے۔ انگلیوں میں سونے کی انگشتریاں اور چھلے ہوتے۔ لکھنؤ میں تھے تو وہاں کے شوقین، خوش پوشاک، رنگین مزاج نوجوانوں میں آپ کا شمار تھا۔ سید صاحب (سید احمد شہید) کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی حضرت مصعب بن عمیرؓ کی طرح کیفیت بدل گئی۔ اب وہ لکھنؤ و عظیم آباد کے بانکے نوجوان نہ تھے بلکہ سید صاحب کی جماعت کے ایک جفاکش مزدور اور معمولی خادم تھے۔ رائے بریلی میں مولانا شہید سے حدیث پڑھتے اور آپ کی جماعت کے نائب تھے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر سر پر اٹھا کر لاتے۔ اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے اور بستی تعمیر[1] کا کام کرتے۔

امام عبدالعزیز نے اپنی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ان تربیت یافتہ افراد کی ایک مرکزی جمعیت بھی بنائی۔ جس میں سب سے پہلے اپنے تینوں بھائیوں مولانا رفیع الدین، مولانا عبدالقادر اور مولانا عبدالغنی کو رکھا۔ سب سے چھوٹے مولانا عبدالغنی پہلے فوت ہو گئے۔ اس لیے اہل دہلی ان سے زیادہ آشنا نہ ہوئے اور "حضرات ثلثہ" کا لفظ اہل دہلی کی زبان میں امام عبدالعزیز اور ان کے دو بھائیوں کے لئے بولا جاتا رہا۔ اس مرکزی جمعیت کی سعی سے نوجوانوں کی ایک جماعت تیار ہو گئی۔ اس جماعت کے سرکردہ بھی تین چار بزرگ تھے (۱) مولانا اسمٰعیل شہید، مولانا عبدالغنی کے صاحبزادے (۲) مولانا عبدالحی دہلوی، مولانا نوراللہ کے پوتے اور امام عبدالعزیز کے داماد (۳) مولانا محمد اسحاق، امام عبدالعزیز کے نواسے (۴) مولانا محمد یعقوب دہلوی متوفی ۱۲۸۲ھ جو مولانا محمد اسحاق کے بھائی تھے۔ سید احمد شہید اس حزب کے ساتھ منسلک ہو گئے۔

خواص کی ان جماعتوں کو تیار کرنے کے ساتھ ساتھ امام عبدالعزیزؒ نے عوام مسلمانوں کو اپنے مقاصد سے آشنا کرنے کیلئے ہفتہ میں دو بار وعظ کہنا شروع کیا اور اس پر آخر تک عمل پیرا رہے۔ ہفتہ میں دو بار منگل اور جمعہ کو دہلی کوچہ چیلاں کے پرانے مدرسہ میں مجلس وعظ منعقد ہوتی تھی جس میں خواص و عام مور و ملخ کی طرح جمع ہو جاتے تھے۔ طرز بیان ایسا دلکش تھا کہ ہر مذہب کا آدمی

---

[1] سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۲۱

مجلس وعظ سے خوش ہو کر اٹھتا تھا۔ آپ کی کوئی بات کسی کو گراں نہ گزرتی تھی۔ اس کے ساتھ ضبط نفس کا یہ عالم تھا کہ شدتِ مرض کے زمانے میں جب ان کے وعظ کا دن آیا تو آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ مجھے اٹھا کر بٹھا دو اور دو آدمی مونڈھے پکڑے رہو۔ لیکن جب بیان کرنا شروع کر دوں تو دونوں شخص مجھے چھوڑ کر علیحدہ ہو جائیں۔ چنانچہ ارشاد کی تعمیل ہوئی اور آپ نہایت اطمینان سے وعظ کہتے رہے۔ گو نبض اور جسم میں ناتوانی و کمزوری کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن استقلال ویسے ہی نمایاں ہو رہا تھا۔

امام عبدالعزیز کے ان وعظوں سے عوام میں مستقل بیداری پیدا ہوئی اور خواص ان سے یہ سیکھ کر وعظ کے ذریعہ عوام کی کس طرح تربیت فکری کی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ تربیت یافتہ خواص آپ کی تحریک کے داعی بن کر ہندوستان کے ہر گوشے میں پھیل گئے۔ اس زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک عالم نے سارے ہندوستان کی سیاحت کی اور اسے علم حدیث کا کوئی بھی استاد ایسا نہ ملا جو امام عبدالعزیز کا شاگرد نہ ہو۔

علاوہ وعظ و تبلیغ کے اس جماعت کے علماء و امام عبدالعزیز کے ساتھ ساتھ ان کی مرکزی جمعیت کے دونوں بازوؤں کے ارکان نے آپ کے طریقہ کے مطابق خواص و عوام کی تربیت کے لیے مختلف کتابیں بھی لکھیں۔ خواص کے لیے مولانا رفیع الدین نے اسرار محبت اور تکمیل الاذہان نام کی کتابیں لکھیں اور ان کے علاوہ متعدد رسائل تصنیف کئے۔ یہ دراصل امام ولی اللہ کے فلسفہ ہی کی تشریح و تفصیل ہے۔ [illegible] کی تحقیق میں ان کا ایک رسالہ نہایت بلند اور عمیق فکر پیش کرتا ہے۔ امام عبدالعزیز نے وہ رسالہ اپنی تفسیر میں نقل کر دیا ہے۔ ایسا ہی سورۂ نور کی تفسیر میں مولانا رفیع الدین کا رسالہ بے نظیر ہے۔

خواص کو حکیم الہند امام ولی اللہ کے فلسفہ کی باریکیوں سے متعارف کرنے کے لئے مولانا اسمٰعیل شہید نے عبقات لکھی۔ اس میں آپ نے شیخ محی الدین ابن عربی متوفی ۶۳۸ھ اور امام ربانی شیخ احمد سرہندی متوفی ۱۰۳۴ھ کی تحقیقات پر بحث کرتے ہوئے امام ولی اللہ کی حکمت کامل سے مقابلہ کیا اور ان پر حکیم الہند کی حکمت کا تفوق ثابت کیا ہے۔ عوام کے لیے مولانا رفیع الدین نے قرآن عظیم

---

لہ مسلمانوں کا شاندار ماضی صفحہ ۲۳۱ ۔ لہ یہ عالم عرب کے متوطن تھے۔ نام یاد نہیں ہے۔ (مولانا آزاد خطوطی)

کا لفظی ترجمہ ہندی[1] میں کیا۔ اس کی مدد سے دہلی کے عوام امام عبدالعزیز کے وعظ سے پوری طرح مستفید ہوتے رہے۔ نیز مولانا عبدالقادر[2] نے قرآن عظیم کا با محاورہ ترجمہ کیا۔ "موضح القرآن" کے ذیل میں آپ کے تشریحی ارشادات آج تک علما کے محققین کے لیے بصیرت افروز ہیں۔ مولانا عبدالحی نے "لغات القرآن"[3] لکھی اور مولانا اسمعیل شہید نے اپنی عربی کتاب "رد الاشراک" کا ترجمہ "تقویۃ الایمان"[4] کے نام سے کیا۔ یہ کتاب اگر پانچ سو برس پہلے لکھی جاتی تو ہندوستانی مسلمان دنیا کے مسلمانوں سے بہت آگے بڑھ جاتا۔ اس کے علاوہ مولانا محمد اسحاق نے حدیث کی کتاب "مشکوٰۃ" کا بھی ہندی میں ترجمہ کیا۔

---

[1] واضح رہے کہ اس زمانے میں اردو کو عموماً ہندی ہی کہا جاتا تھا۔

[2] شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمے کے متعلق "واقعات دہلی" صفحہ ۷۰۵ میں مذکور ہے کہ یہ ترجمہ ۱۲۰۵ھ میں ہوا۔ شاہ عبدالقادر کے ترجمے کا ایک ایڈیشن مطبع مفید عام آگرہ نواب شاہجہان بیگم صاحبہ والی بھوپال کے حکم سے چھپا تھا۔ اس میں شاہ عبدالقادر کا دیباچہ بھی ہے۔ دیباچے میں فرماتے ہیں: "اس بندۂ عاجز عبدالقادر کو خیال آیا کہ جس طرح ہمارے والد بزرگوار حضرت شیخ ولی اللہ بن عبدالرحیم دہلوی فارسی ترجمہ کر گئے ہیں سہل و آسان اب ہندی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کرے۔ الحمد للہ کہ ۱۲۰۵ھ میں میسر ہوا۔" کچھ عرصہ بعد آپ نے بعض فوائد "موضح القرآن" کے تاریخی نام سے لکھے۔ اس عبارت سے خیال گزرتا ہے کہ شاہ عبدالقادر اپنے بھائی کے اردو ترجمہ سے مطلع نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ شاہ رفیع نے اسی سال یا اس کے بعد ترجمہ لکھا۔ بعض پرانے ثقات سے سنی ہوئی بات ہے کہ شاہ رفیع الدین نے صرف چند سورتوں کا ترجمہ کیا۔ اور مولانا عبدالحی نے اسے پورا کیا۔ دونوں ترجموں پر مولوی نذیر احمد نے اپنے ترجمۂ قرآن کے دیباچے میں جو کچھ لکھا ہے وہ قابل ملاحظہ ہے۔

[3] "لغات القرآن" فارسی زبان میں ہے اور طبع ہو چکی ہے۔ ہمیں طالب العلمی کے زمانے میں دیوبند میں مفت تقسیم ہو کر ملی تھی۔ مکررات کو حذف کر کے وہ علی الترتیب مشکل الفاظ کا ترجمہ فارسی میں دیتے جاتے ہیں۔ مثلاً "لاریب فیہ" میں ریب ہے، اس کا ترجمہ "شک" کے معنی و علیٰ ہذا القیاس۔ عوام سے لغت یاد ہو کر قرآن عظیم کا سمجھنا سہل ہو جاتا ہے۔

[4] یعنی اس میں شرک و رسوم کا اثر تک آنے نہ پایا۔ حنفی طریق البتہ ملحوظ ہے۔

امام عبدالعزیز کی تعلیم و ارشاد کا اثر ہندوستان سے باہر حجاز کے ذریعہ استنبول تک پہنچا۔ غالباً شیخ خالد کردی کی تکمیل اسی میں واسطہ ہے۔ شیخ موصوف نے مولانا غلام علی کی خدمت میں سلوک کی تکمیل کی تھی اور مولانا اسمٰعیل شہید کی صحبت کے توسط سے امام عبدالعزیز سے مستفید ہوئے تھے۔ شیخ خالد کردی کا ایک مشہور قصیدہ ہے، جس میں موصوف نے بیان کیا ہے کہ میں علمائے خراسان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیکن طبیعت مطمئن نہ ہوئی۔ میں نے دہلی میں مولانا غلام علی کی خدمت میں جانے کا ارادہ کیا تو وہ لوگ مانع ہوئے، مگر میں ان کے کہنے میں نہ آیا۔ اس قصیدہ کا ایک شعر ہے۔

دہلی ظلمات کفر است گفتند و من گفتم
بظلمات رو اگر در جستجوئے آب حیوانی

---

(بقیہ حاشیہ) ہندوستان کی پرانی سیکالوجی سے بہت مناسبت رکھتا ہے۔ اگر یہ تعلیم ایک ہندوستانی سلیم الفطرۃ کو ملتی تو وہ دوسری قوموں سے اسلامیت میں بہت بڑھ جاتا۔ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ بغداد سے جب علوم خراسان تک گئے تو وہ لوگ تشبیہ اور تنزیہ کے جھگڑوں میں اس قدر پریشان ہوئے کہ اسلام کی صحیح تعلیم میں پیچھے رہ گئے۔ ہندوستانی عقل اس مسئلے کو بہت آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اور حنفی طریقہ بھی اس تجلی الٰہی کے ذریعہ سارے علوم و اسرار معرفت الٰہی سکھاتا ہے۔ تجلی کے مسئلے کو خراسانیوں نے نہیں سمجھا۔ اس لیے مسلمانوں کو بتوں نے اس وجہ سے بہت پیچھے ڈال دیا اور قرآن ان کی ذہنیت پر منطبق ہی نہیں ہوتا جب تک وہ اس کی کوئی تاویل نہ کریں۔ صوفیائے کرام نے اس ذہنیت کو کم کرنے کی یقیناً کوشش کی، مگر یہ صاحب بیان نہ تھے کہ علماء ان سے استفادہ کرتے۔ بے شک وہ صاحب حال تھے ان کی صحبت میں یہ بڑا رنگ لگا۔

"کتاب التوحید" میں شاہ اسمٰعیل شہید کے متعلق مولانا سندھی فرماتے ہیں: "اسلام کے اظہار سے پہلے میں نے شاہ صاحب کی تقویۃ الایمان پڑھی تھی۔ چنانچہ توحید شرک کے متعلق مجھے اس سے بڑا فائدہ پہنچا۔ بلکہ ایک لحاظ سے یہ کتاب مجھے اسلام میں لانے کا ذریعہ بنی۔۔۔ غرضیکہ امام محمد اسمٰعیل میرے استاد اور امام ہیں اور مجھے ان سے بہت محبت ہے۔ ایسی محبت جس طرح لوگ اپنے مذاہب کے ائمہ سے کرتے ہیں۔"

خالدکردی کے شیخ طریقت مولانا غلام علی بھی امام عبدالعزیز کے اصحاب میں سے تھے۔
استنبول کے علماء کی طرف سے امام عبدالعزیز کی خدمت میں یہ دعوت نامہ آیا کہ آپ آستانہ تشریف لائیں تو یہاں کی تمام علمی جماعتیں آپ کی سیادت میں کام کریں گی۔ لیکن امام عبدالعزیز نے اپنے دادا امام شاہ ولی اللہ کے ہندوستانی کام کی تکمیل سے علیحدہ ہونا پسند نہ کیا۔

حکیم الہند امام ولی اللہ نے اپنی دعوتِ فکر اور نظامِ اجتماع کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جو جماعت بنائی تھی، اس کی اپنی امتیازی خصوصیات تھیں ۔ چنانچہ جن لوگوں نے امام ولی اللہ، امام عبدالعزیز اور ان کے رفقاء کی کتابیں نہیں پڑھیں، وہ حزب ولی اللہ کی ان امتیازی خصوصیات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اس حزب کے مقاصد کے بارے میں بہت کم عربی زبان میں لکھا گیا ہے۔ البتہ عربی سے زیادہ فارسی زبان میں۔ اور پھر خالص ہندی یعنی اردو میں حزب ولی اللہ پر کتابیں تحریر ہوئیں۔ عربی چونکہ دنیائے اسلام کی مشترک زبان تھی اور اس میں حزب ولی اللہ کے متعلق بہت کم لکھا گیا تھا، اس لئے عربی اور ترکی ممالک ولی اللہی تحریک سے زیادہ روشناس نہ ہو سکے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی ضرور پیش نظر رہنی چاہیئے کہ امام ولی اللہ اور امام عبدالعزیز کے زمانے میں بیرون ہند جس قدر اسلامی تحریکیں پیدا ہوئیں، جیسے ایران میں بابی، نجد میں وہابی اور یمن میں زیدی۔ ان سب کے اپنے اپنے خاص پروگرام تھے، اور حزب ولی اللہ کی ہندوستانی تحریک نہ تو ان میں سے کسی مقصد میں اشتراک رکھتی ہے، اور نہ کسی تحریک سے اس کا طریق عمل مشابہ ہے۔ ظاہر ہے حزب ولی اللہ کی ایران کی بابی تحریک کے ساتھ مشابہت تو کسی کے وہم و گمان میں نہیں آسکتی، کیونکہ بابی تحریک ایرانی شیعوں کی تحریک تھی، جو ولی اللہی تحریک کے اساسی اصولوں ہی سے

---

لـه یہ روایت زبانی ہے اور مشائخ دیوبند میں مسلسل چلی آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا رحمت اللہ مہاجر مکی کا استنبول سے تعلق تھا اور دعوت میں ایسے الفاظ تھے کہ ہم آپ کی کفش برداری کو فخر سمجھتے ہیں۔ مولوی محمد حسین بٹالوی کی اشاعۃ السنۃ میں غالباً اس کے متعلق کچھ حوالے ہیں ہندی فارسی میں یا ایرانی فارسی میں۔

ایک یہ تھا کہ عوام و خواص کو فرقہ شیعہ کی غلطیوں سے بچایا جائے۔ البتہ عرب کی نجدی تحریک سے ولی اللّٰہی تحریک بعض امور میں اشتراک رکھتی ہے، اس لئے ظاہر میں دونوں کو یکساں سمجھ لیتے ہیں۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ کے ماننے والوں میں سے سرزمین نجد میں ۱۱۵۰ھ میں محمد بن عبد الوہاب پیدا ہوئے۔ انہوں نے لوگوں کو توحید کی دعوت دی۔ حضرت ولی اللہ میں بھی توحید کی دعوت اسی طرح موجود ہے۔ اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا احترام بھی دونوں تحریکوں میں مسلّم ہے۔

امام ولی اللہ جب حجاز تشریف لے گئے تو انہوں نے شیخ ابراہیم کردی مدنی کے کتب خانہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تصنیفات سے بے شک کافی استفادہ کیا تھا۔ امام ولی اللہ کی کتاب ازالۃ الخفاء میں بعض اساسی مسائل ایسے مذکور ہیں جو یقیناً شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی تصنیف منہاج السنۃ سے لئے گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ حجاز کے قیام کے دوران میں شاہ ولی اللہ نے سب سے زیادہ فائدہ شیخ ابو طاہر سے اٹھایا تھا۔ شیخ موصوف کے والد شیخ ابراہیم کردی کے متعلق ابجد العلوم صفحہ ۹۴۶ میں لکھا ہے۔

"موصوف علوم فقہ و حدیث اور عربی میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ آپ نے اس سلسلے میں کئی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ موصوف نے بغداد، شام، مصر اور مکہ مدینہ کی سیاحت کی۔ القشاشی کی صحبت میں بیٹھے اور ان سے حدیث کی روایت کی۔ شیخ فارسی، کردی، ترکی اور عربی یکساں بولتے تھے۔ آپ کی مجلس پر رونق و تازگی

---

ف حضرت عثمان سے پہلے جو زمانہ گزرا اس کے متعلق شاہ ولی اللہ کا یہ نظریہ ہے کہ صحابہ میں اختلاف ہوا ہی نہیں البتہ جس قدر اختلاف مروی ہے وہ مشورہ کرنے میں جیسے اختلاف ہوتے ہیں اس نمونہ کا ہے۔ مگر یہ کہ صحابہ کے فیصلہ میں اختلاف ہوتا، ایسا کبھی نہیں ہوا۔ وہ جب مشورے کے لیے بیٹھتے تو ایک نہ ایک فیصلہ پر متفق ہو کر اٹھتے۔ اس پر شاہ صاحب نے ازالۃ الخفاء میں بڑی شرح و بسط سے بحث کی ہے۔ یہ ان کی بہت بڑی علمی اساسی چیز ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ منہاج میں اس کو ایک آدھ سطر میں لکھ جاتے ہیں۔ مگر بہر حال اس امر کا اعتراف ضرور کرنا ہوگا کہ ہم شاہ ولی اللہ کی اس لئے عزت نہیں کرتے کہ وہ تمام چیزیں از خود ایجاد کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ شاہ صاحب علم و معرفت میں اور ائمہ متقدمین کی صحیح باتیں اخذ کر لیتے ہیں۔ یہ ان کی عظمت کا راز ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ شیخ اکبر اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ دونوں کی اچھی تحقیقات یکساں طریقہ پر قبول کرتے ہیں۔

میں خلط بریں کا ایک نمونہ تھی۔ بوصوف حکمت تصوف کے حقائق پر صوفیہ کے ارشادات کو ترجیح دیا
کرتے اور فرماتے کہ یہ فلسفی حقیقت کے قریب ضرور تک تو پہنچ جاتے ہیں لیکن حقیقت کا ادراک ان
کے بس میں نہیں۔ آپ کی وفات کی تاریخ إِنَّا عَلَىٰ فِرَاقِكَ يَا إِبْرَاهِيمُ لَمَحْزُونُونَ ۔ ہم
آپ کی مفارقت پر غم زدہ ہیں ہے۔ امام ولی اللہ اپنے استاذ شیخ ابو طاہر کے توسط سے انہی شیخ
ابراہیم کی اتباع میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی یکساں عزت کرتے ہیں اور
دونوں کی عظمت کے معترف ہیں لیکن وہ اس میں امام ربانی شیخ احمد سرہندی کو بھی شامل کرتے
ہیں۔ ان کے نزدیک امام ربانی کے بعض بیانات کے اغلاق سے ان کے مطالب کی صحت پر کوئی
اثر نہیں پڑتا۔

ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں کہ ولی اللہی تحریک عرب کی نجدی تحریک سے بعض امور میں متشابہ تھی۔
اس کی ایک مثال اسمٰعیل شہید کی کتاب تقویۃ الایمان ہے۔ یہ کتاب حجۃ اللہ البالغہ سے ماخوذ ہے
لیکن بعض مقامات پر اس میں شیخ عبدالوہاب کی کتاب "التوحید" کی طرح ایک سی بات لکھی ہے۔
یہ اسباب ہیں جن کی بنا پر ہندوستان کے وہ اہل علم جو حزب ولی اللہ کے مخالف تھے ان مشترک
مباحث کی وجہ سے دونوں تحریکوں کو ایک ثابت کرنے کے لیے کافی سے زیادہ کوشاں رہے۔ لیکن
اگر ولی اللہی تحریک کے اساس و مبادی پر اچھی طرح سے غور کیا جائے تو دونوں تحریکوں کی یکجہتی
کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتی۔ امام ولی اللہ کی فلسفیت اور ان کا فلسفہ وحدۃ الوجود پر مرکوز ہے۔
اور آپ امام ربانی کے وحدۃ الشہود کے عقیدہ کو بھی وحدت الوجود کے ساتھ مطابقت دیتے ہیں
دوسری طرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ ہیں اور وحدت الوجود کے ماننے والوں سے اس قدر شدید نفرت
رکھتے ہیں کہ دنیا جانتی ہے۔ ظاہر ہے جب دونوں تحریکوں کے اساس و مبادی میں اس قدر اختلاف
ہے تو ان کو محض بعض امور میں متشابہ ہونے کی وجہ سے ایک نہیں کہا جا سکتا۔

تحریک ولی اللہی اور نجدی تحریک میں عدم یکجہتی کی ایک اور مثال لیجیے۔ مولانا اسمٰعیل شہید
"تقویۃ الایمان" میں "التوسل فی الدعا" کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اور مشرک صفت کے مرتکب کو کافر نہیں جانتے

گو اسے غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ تقویۃ الایمان کے یہ دو ایسے ہی حصے ہیں جو کتاب التوحید کے مطابق ہیں
اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کے پیرو ایسے لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ اجزائی دو شکلوں میں مولانا
محمد اسمٰعیل شہید کے تابع ہیں۔ ایسی حالت میں دونوں تحریکوں کو ایک ہی سطحی نظر اور سرسری طور
پر سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

عرب کی ایک دوسری تحریک کے اجزا میں سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک بزرگ عالم شوکانیؒ ہیں جو
بڑے محقق اور محدث تھے۔ حزب ولی اللہ کے پیروؤں میں سے بعض فرقے مستقل طور پر امام شوکانی کی
متابعت کا دم بھرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اتباعِ سنت کی تفصیلی دعوت میں امام شوکانی بھی حزب ولی اللہ
کے شریک کار ہیں۔ لیکن حقیقت شناس جانتے ہیں کہ شوکانی زیدی ہیں اور گو مفید سے بعض مسائل میں
وہ متفق ہیں، پھر بھی وہ حجیتِ اجماع* پر صاف رائے نہیں رکھتے۔ قاضی شوکانی کی کتاب "ارشاد الفحول"
اور مولانا اسمٰعیل شہید کا رسالہ "اصولِ فقہ" ملا کر پڑھئے تو فرق واضح ہو جائے گا۔

اس وضاحت کے بعد ولی اللّٰہی تحریک کا سلسلہ عرب کی نجدی اور یمنی تحریک سے ملانا اور ان سب
کو ایک ہی زمرے میں داخل کرنا کسی طرح بھی قرینِ صواب نہیں ہو سکتا۔ در اصل اگر کوئی بزرگ امام
ولی اللہ کی تحریک کے لیے سلف صالح کا مرتبہ رکھتے ہیں تو وہ فقط امام ربانی شیخ احمد سرہندی مجدد الف
ثانیؒ ہیں۔ ان کو امام ولی اللہ اپنے طریقہ کا امام مانتے ہیں۔ امام ربانی نے جو کام شروع کیا تھا امام

---

* حجیتِ اجماع پر مدار ہے صدیق اکبرؓ کی خلافت کا اور مصحف عثمانؓ کے مسلّم اور متواتر ہونے کا۔ اس زمانے میں
ہم اجماع کے بجائے مرکزی جمعیت کا فیصلہ کہہ سکتے ہیں۔ آج جس چیز کو مرکزی جمعیت کا فیصلہ کہا جاتا ہے وہی اس
زمانے میں اجماع سے مقصود تھا۔ اجماع یا مرکزی جمعیت کے فیصلہ کو قانونی طور پر حجت سمجھے بغیر کوئی بڑی
تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ شیعہ اجماع کی اس قانونی حجیت کو نہیں مانتے۔ مگر اہلِ سنت کا مدار سراسر اسی پر ہے۔
اگر ذرا بھی غور کیا جائے تو دونوں مسلکوں کا فرق صاف نمایاں ہو جاتا ہے۔

سنی اور امامی سے مراد یہاں ہر امام کے ماننے والا ہے۔ مثلاً ہمیں امامت بلا فصل تو شیعوں میں جس قدر شیعے فرقے
ہیں ان کو شمار کرنا اسی کا درجہ رکھتا ہے۔

ولی اللہ نے اس کو مکمل کر دیا۔

الغرض جب امام عبدالعزیز اور ان کی مرکزی جمعیت کے ارکان کی علمی، تبلیغی، فکری اور عملی جدوجہد سے ولی اللٰہی تحریک کے مبادی کا تعارف ملت سے اچھی طرح سے ہو گیا تو اس وقت امام عبدالعزیز ایک ایسے نوجوان کی راہ دیکھ رہے تھے جو عسکری معاملات سے دلچسپی رکھتا ہو تاکہ اس کے ذریعہ اپنی انقلابی تحریک کے دوسرے حصے کی تکمیل کرائیں۔ اللہ کی رحمت سے رائے بریلی کے سید شاہ علم اللہ کے خاندان کا ایک نوجوان سید احمد امام عبدالعزیز کی دعوت میں شرکت کے لیے آیا۔ موصوف انہیں اس مطلب کے لیے زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کی تربیت کی طرف خاص توجہ کی جانے لگی۔

سید شاہ علم اللہ عالمگیری عہد کے مشہور عالم ربانی اور صاحب سلسلہ شیخ تھے۔ ان کے فرزند سید محمد ضیا اور ان کے بیٹے شاہ ابو سعید ہیں۔ آپ سید احمد شہید کے جد مادری اور امام ولی اللہ کے خلیفہ تھے۔ شاہ علم اللہ کا دائرہ رائے بریلی میں تھا اور ولی اللٰہی تحریک کے ابتدائی مرکزوں کے سلسلے میں اس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ سید احمد شہید صفر سنہ ۱۲۰۱ھ میں اسی دائرہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سید محمد عرفان تھا۔ سید احمد شہید نے عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا محمد اسحاق اور مولانا اسمٰعیل شہید سے پڑھیں۔ قرآن مجید کا ترجمہ اور حدیث مولانا عبدالقادر کے درس میں سنتے رہے۔ اور انہیں کی صحبت میں سلوک کی تکمیل کی۔ سید احمد شہید کے متعلق سر سید احمد دہلوی اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں لکھتے ہیں:۔

"سید احمد بریلوی اوائل حال میں شوق طالب علمی میں وارد شاہجہان آباد ہو کر مسجد اکبر آبادی میں فروکش ہوئے اور صرف و نحو میں فی الجملہ سواد حاصل کیا۔ اکثر خدمت مسجد اور اس مقام کے یاروں خصوصاً درویشان پاک طینت کی جو تحصیل علم باطنی کے شوق میں جناب مولانا عبدالقادر کی خدمت میں حاضر رہتے تھے، خاطر داری اور سرانجام مہام میں ایسے سرگرم ہوتے گویا اس امر کو اہم مہام سمجھے ہوئے تھے۔"

جب ذکر اللہ سید احمد شہید کی طبیعت میں راسخ ہو گیا تو ان کی عالی دماغی اور اولوالعزمی سے ایسے

کلمات صادر ہوئے جو ایک ایسے مصلح کی زبان سے نکلتے ہیں جو تمام انسانیت کو راہِ راست پر لانا چاہتا
ہو۔ امام عبدالعزیز نے یہ کلمات سُنے تو فرمایا۔ تِلْكَ خَيَالَاتٌ نُرَبِّي بِهَا أَطْفَالَ الطَّرِيقَةِ۔ یعنی
اسی طرح ان کے نظریۂ جوہر کی تربیت ہو رہی ہے۔[1] ۱۲۲۵ھ یا ۱۸۱۰ء میں امام عبدالعزیز نے سید احمد شہید
کو فوجی تربیت کے لیے امیر خاں والی ٹونک کے لشکر میں بھیجا۔ موصوف نواب مرحوم کے لشکر میں چھ
سال سے زائد رہے۔ ۱۲۳۱ھ یعنی ۱۸۱۶ء میں جب نواب امیر خاں نے انگریزوں سے صلح کر لی تو
سید احمد شہید واپس امام عبدالعزیز کی خدمت میں پہنچ گئے۔

امام عبدالعزیز کے خواص اصحاب جن کے رگ و ریشہ میں حضرت ولی اللہ کی خصوصیات سرایت
کر چکی تھیں اور ایک لمبے زمانے سے ان کی تربیت ہو رہی تھی، یہ وہ لوگ تھے جن کا تذکرہ ہم پہلے
کر چکے ہیں۔ سید احمد شہید دراصل اس جماعت میں سے نہ تھے بلکہ بعد میں ان کے ساتھ منضم کیے گئے۔
موصوف میں کشفی کمالات تھے۔ سپہ گری کی تعلیم تھی۔ اور پھر آپ سید تھے۔ اس لیے امام عبدالعزیز

---

[1] جب کوئی پہلوان شاگردوں کو کشتی سکھاتا ہے۔ تو یوں کرتا ہے کہ خود ان سے آگے گر جاتا ہے۔ شاگرد سمجھتا ہے
کہ میں نے استاد کو گرا لیا۔ اس سے اصل میں اس کی تربیت مقصود ہوتی ہے۔ یہی مثال سید احمد شہید کی تھی۔ انکی زبان سے
چند باتیں مرزد ہوتی تھیں کہ میں یہ یوں کروں گا۔ اس طرح کر دکھاؤں گا۔ اس سے ان پر ایک حال جو شگفتگی پیدا ہو رہی تھی سید صاحب
کا ایک جملہ "سوانح" میں منقول ہے کہ "انہوں نے اپنے اہل بیت میں سے کسی کو یہ کہا کہ اگر تمہیں کوئی کہے کہ
سید احمد فوت ہو گیا ہے تو جب تک تم یہ نہ دیکھو کہ ہندوستان سے کفر نکل گیا ہے۔ افغانوں سے فلاں فلاں عیب
جاتے رہے ہیں سے فلاں فلاں خرابی دور ہو گئی۔ ترکوں کی فلاں کمزوری رفع ہو گئی ہے جب تک یہ ساری باتیں پوری
نہ ہو لیں کبھی یقین نہ کرنا کہ سید احمد فوت ہو گئے ہیں۔ یہ ہے تِلْكَ خَيَالَاتٌ نُرَبِّي بِهَا أَطْفَالَ الطَّرِيقَةِ یہ حال جو شگفتگی
کہ سید صاحب نے امام عبدالعزیز کو لکھا۔ وہ خاکسار قدم بوسی کو حاضر ہوتا ہے۔ یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم
ہو گیا۔ نواب صاحب انگریزوں سے مل گئے۔ اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں تو سیرت صفحہ ۱۲۰
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا سندھی نے امیر شہید کا مستقل عنوان سے "تذکرہ" نہیں
کیا۔ محمد نور الحق۔

نے ان کو امارت جہاد کے لیے موزوں سمجھا۔ لیکن ان کے ساتھ اپنے مکمل تربیت یافتہ افراد میں سے دو وزیر مقرر کر دیے۔ حقیقت میں جہاد کی قیادت اس منتخب بورڈ کے ہاتھ میں تھی گو امارت سید احمد شہید کے سپرد کی گئی تھی۔ اس تقسیم کار کو سمجھنے کے لیے امام ولی اللہ کی کتاب "بدور بازغہ" سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ حکیم الہند نے اجتماع انسانی کی مدنی ضروریات کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ قضاء، شہریاریت، جہاد، نقابت، اندازہ و تخمین۔ ان میں سے ہر ایک کی تکمیل کے لیے ایک ایسے کامل کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کام کو چلانے کی خصوصی مہارت رکھتا ہو۔ ان پانچ رہنماؤں کے ساتھ ایک ایسا امیر بھی چاہیے جس کو ان تمام کاموں میں مہارت کاملہ حاصل ہو۔ وہی حقیقی طور پر امام بننے کا مستحق ہے۔ فان جمع الواحد ما تکفل بہ جمیع ہؤلاء فھو الامام الحق۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اکثر تو یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ان میں سے دو یا تین کاموں کو ایک آدمی اپنے ذمے لیتا ہے اور باقی کاموں کو دوسرا آدمی۔ مدینہ فاضلہ میں تو ہر کام کا ایک ایک رواج بن جاتا ہے جو شخص اس کام کا کرتا دھرتا ہوتا ہے وہ اسی رواج کے مطابق اپنی رائے دیتا ہے۔ اور کام چلانے کی تیسری صورت یہ ہے کہ قوم کے ممتاز اور عقلمند لوگ باہم مل بیٹھتے ہیں۔

آج کل کی زبان میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک حقیقی امام کا جو ڈکٹیٹر بن سکے پیدا ہونا آسان نہیں۔ اس کے نہ ملنے پر حکومت کی تشکیل ان تین صورتوں میں سے کسی ایک پر ہو سکتی ہے (۱) چند افراد کا ایک بورڈ بنا دیا جائے۔ (۲) اگر محدود سوسائٹی ہو تو اس کا ہر ایک حصہ اپنے مسلّمہ رواج کو ماننے اور اپنے رئیس کی اطاعت میں قومی قانون کی پابندی کرے یعنی سوسائٹی کو حکومت بنانے کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ ان میں اس قسم کے اختلاف پیدا ہی نہیں ہوتے جن کی وجہ سے وہ امام بنانے پر مجبور ہوں۔ (۳) عقلمندوں یا عوام کے مقبول لوگوں کا اجتماع ہو یعنی پارلیمنٹ بنے۔

---

لہ مدینہ فاضلہ سے مراد وہ اجتماع ہے جس میں باقاعدہ حکومت ہو۔ اور مدینہ ناقصہ جہاں منظم حکومت نہ ہو۔ آجکل کی اصطلاح میں اسے سوسائٹی کہتے ہیں۔ انارکسٹ حکومت کو نہیں مانتے۔ انکے نزدیک سوسائٹی پانچویں ترقی تک جاتی ہے۔

ولی اللّٰہی تحریک کے ایک اصول کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ امام ولی اللہ کے نزدیک جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اسلام کی مستقل حکومت کا آغاز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی سے ہی ہو چکا تھا۔ اور آپ کے دُعاۃ یعنی دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والے اس مستقل حکومت کے امیر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اسوۂ حسنہ کے نمونہ پر حزب ولی اللہ کی تنظیم میں بھی دُعاۃ کے سلسلے کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ امام عبدالعزیز نے امیر شہید، مولانا عبدالحی اور مولانا محمد اسمٰعیل کو دراصل اسی سلسلہ دعاۃ کا نظام قائم کرنے کے لیے اطرافِ ملک میں روانہ کیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ گویا ابتداء تھی اس امر کی کہ حزب ولی اللہ اپنی سیاسی پارٹی کی تشکیل و تنظیم کر کے اب امارت (حکومت) کی بنیاد رکھنا چاہتی ہے، یعنی یہ لوگ اب اپنی حکومت بنائیں گے اور جہاد کریں گے۔

۱۲۳۹ھ میں جب یہ قافلہ حج سے واپس آیا تو امام عبدالعزیز فوت ہو چکے تھے۔ اور انھوں نے اپنے آخری وقت میں مولانا محمد اسحاق کو مدرسہ سپرد کر کے اپنا قائم مقام بنا دیا تھا۔

# الصدر الحمید امام محمد اسحاق

## ۱۲۳۹ھ تا ۱۲۶۲ھ

۱۲۳۹ھ میں امام عبدالعزیز فوت ہوئے تو آپ نے اپنا مدرسہ مولانا محمد اسحاق کے سپرد کیا۔ یہ ترتیب ولی اللہ کی امامت کا عرفی دستور تھا۔ سید احمد شہید کا قافلہ جب حج سے واپس آیا تو انہوں نے امام عبدالعزیز کے بعد شاہ محمد اسحاق کی امامت کو تسلیم کر لیا۔ اس زمانے میں اگر جمعیت کا اجلاس مدرسہ میں ہوتا تو مولانا محمد اسحاق صدارت کرتے اور سید احمد شہید حلقے میں بیٹھتے۔ جب مدرسہ سے باہر مجلس منعقد ہوتی تو سید احمد شہید صدر ہوتے اور مولانا محمد اسحاق حلقے میں شریک ہوتے[1]۔ اس طرح حزب ولی اللہ کی سیاسی جماعت کی ماتحت اور رجال اور اموال جمع کرنے کے لیے دعوت کا سلسلہ امام عبدالعزیز کے مدرسہ سے متعلق رہا اور عسکری اور سیاسی قیادت سید احمد شہید کی جماعت سے وابستہ ہو گئی۔

---

[1] اس روایت کی اصل "امیر الروایات" کا بیان ہے۔ "امیر الروایات" اور "ارواح ثلاثہ" کی تصنیف کا تعلق امیر شاہ خاں صاحب سے ہے جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے خاص خادم ہیں۔ یہ کتابیں انہی کی بیان فرمودہ حکایات کا مجموعہ ہیں۔ خاں صاحب کا کہنا یہ تھا کہ جملہ واقعات ان کو سند اور حوالے سمیت لفظ بلفظ یاد تھے۔ مترجم کے متن و (باقی اگلے صفحہ پر)

سید احمد شہید معہ اپنے ہمراہیوں کے ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ کو دو سال گیارہ ماہ بعد سفر حج سے واپس آگئے تھے۔ اسی سال یعنی محرم ۱۲۴۱ھ میں جہاد کی تیاری شروع کر دی گئی۔ مولانا محمد اسمٰعیل اور مولانا عبدالحی نے ترغیب جہاد کے لیے اطراف ہند کا دورہ کیا۔ جب تقریباً دو ہزار مجاہدین کا اجتماع ہو گیا تو امیر شہید نے ان کے تین حصے کر دیے اور انہیں کوچ کا حکم دیا۔ خود کچھ عرصہ ٹونک رہ کر پہلے اجمیر شریف اور پھر دہلی آئے۔ اور ۱۲۴۲ھ کے آغاز میں دیوبند، سہارنپور، پانی پت، کرنال، تھانیسر وغیرہ سے گزرتے ہوئے مالیر کوٹلہ پہنچے۔ وہاں سے ممدوٹ، بہاولپور، حیدرآباد (سندھ) شکارپور، جاگن، خان گڑھ، درہ بولان، کوئٹہ، قندھار اور کابل سے گزرتے ہوئے براہ خیبر پشاور آگئے۔ پشاور سے ہشت نگر گئے اور وہاں موضع خویشگی میں قیام فرمایا۔ پھر نوشہرہ تشریف لے گئے۔ دوسری جماعت جو ان کے پیچھے تیار ہو رہی تھی ان کو دکھانے کا کام سپرد کیا گیا۔

الغرض ۱۲۴۱ھ میں ہجرت شروع ہوئی اور ۲۰ جمادی الآخر ۱۲۴۲ھ (۲۰ جنوری ۱۸۲۷ء) کو افغانی

---

(باقی حاشیہ) حین و قصبہ علی گڑھ میں رہتے تھے۔ بہت سے فضلاء و اکابر کی صحبت پائی تھی۔ سی کا التزام کرتے ہوئے حدیث کی طرح خاندان ولی اللہی کے بزرگوں اور اکابر سلسلہ دیوبند کے حالات و واقعات سناتے۔ آپ کا کوئی جملہ مشکل ہی سے خالی ہو۔ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے مولوی حبیب احمد کیرانوی کے ذریعہ ان کی زبانی روایات کو قلمبند کرایا اور اس مجموعہ کو امیر الروایات کے نام سے شائع کرایا۔ بعد میں مولانا طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے جمع کردہ حالات، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا تھانوی کے ملفوظات اور بعض دیگر اضافات کے ساتھ یہ مجموعہ ارواح ثلاثہ کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں سید صاحب، شاہ اسمٰعیل صاحب اور مولانا عبدالحی صاحب کے متعلق نہایت کارآمد معلومات کا ذخیرہ ہے۔ سیرت سید احمد شہیدؒ وغیرہ ص ۳۸۹

امیر الروایات کی مذکورہ بالا حکایت سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اجتماع ایک مرکز یعنی شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ ہے اور شاہ اسحاق اس کے رئیس تھے۔ امیر شہید چونکہ عسکری نظام کے سردار تھے اور وہ لشکر جمع کرنے کا تھا اس لیے بیرون ہندوستان کو امارت حاصل تھی۔

جیسکتے تھے بلکہ اجتماعی فیصلہ پر حکومت کا تمام تر دار و مدار تھا۔

شعبان ۱۲۴۳ھ بروز یکشنبہ مولانا عبدالحی نے انتقال فرمایا۔ اس سے مجاہدین کی جماعت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ نیز ان کی وفات کے بعد ولی اللہی تحریک میں ایک اساسی تغیر رونما ہوا جس کے نتائج آگے چل کر شدید ثابت ہوئے۔ اب تک اس تحریک کے پیش نظر یہ تھا کہ سلطنت دہلی کے بجائے جس کا نظم بالکل فرسودہ ہو چکا تھا امام ولی اللہ کے انقلابی پروگرام کو عملی شکل دی جائے۔ اسی مقصد کی خاطر شاہ ولی اللہ نے مرہٹوں کے زور کو توڑنے کے لیے احمد شاہ ابدالی کو بلوایا تھا۔ اسی طرح شاہ عبدالعزیز چاہتے تھے کہ سکھوں کے خلاف جو پنجاب پر قابض تھے، افغانوں سے مدد لی جائے اور پنجاب کی اس باغی حکومت کو ختم کر کے کابل اور دہلی کا پھر سے اتصال قائم کر دیا جائے۔ کیونکہ مستقبل کی ترقی کا سارا انحصار اسی پر تھا۔ چنانچہ اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے یہ ساری جد و جہد کی جا رہی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ ولی اللہی تحریک کا دہلی اور ہندوستان سے خصوصی تعلق تھا۔ اور ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کے اصولوں پر حکومت قائم کرنا مذہب ولی اللہ کے بنیادی اصولوں میں داخل تھا۔ چنانچہ دہلی کو اس تحریک میں مرکزیت کی حیثیت حاصل تھی۔ سید صاحب اور ان کی مجاہدین کی جماعت دہلی ہی کے مرکز کی تابع تھی اور وہاں کو روپیہ اور آدمی بھی وہیں سے بھیجے جاتے تھے۔ لیکن مولانا عبدالحی کے انتقال کے بعد ولی اللہی تحریک کی اس خصوصیت میں فرق آگیا اور دہلی سے سرکشی اور بغاوت کے آثار پیدا ہونے لگے۔ چنانچہ صوبہ سرحد میں جو قوت حکومت بن رہی تھی وہ ایک مستقل مرکز کی حیثیت اختیار کر کے دہلی کی حریف بننے لگی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ شاہ ولی اللہ کا جو طریقہ حکومت تھا بدل گیا اور لیڈروں کی امامت کی جگہ شخصی امامت (ڈکٹیٹرشپ) نے لے لی۔ سید احمد شہید امیر المومنین اور دنیائے اسلام کے مصلح خلیفہ مانے جانے لگے۔ اب وہ ساری دنیا کے ایک طرح سے امیر بن گئے۔ چنانچہ اگر افغان سرداروں کے لیے ان کی اطاعت مذہبی فرض تھی تو بخارا اور دوسرے ممالک بھی ان کی اطاعت سے سبکدوش نہیں ہو سکتے تھے۔ لہٰذا ان کو تسلیم کرنا دنیا کے سب مسلمانوں کا مذہبی فریضہ بن گیا اور اس کی وجہ سے مرکز یعنی دہلی کی خصوصی حیثیت جاتی رہی۔[1]

[1] ہمارے خیال میں اس تغیر میں ایسٹ انڈیا کمپنی بہادر کی ڈپلومیٹک چال کو بڑا دخل ہے۔

اس اساسی تجربے سے یہ بھی ہوا کہ حنفی فقہ کے بارے میں حزب ولی اللہ کی جو خصوصیات تھیں ان پر زور نہ دیا جاتا۔ بلکہ نجدی اور یمنی طریقوں پر کام کرنے والے چند ہندوستانی تو حنفی فقہ کی پابندی بھی اپنے لئے ضروری نہ سمجھتے۔ اس کی وجہ سے افغانوں کی ان مجاہدین سے بھی مذہبی عداوت ہو گئی۔ گو امیر سید احمد شہید نے بار بار اعلانات سے افغانوں اور عوام کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ امیر اور ان کا خاندان حیثیت سے محققین حنفیہ کے طریقہ کا پابند رہا ہے، مگر یہ لوگ تھے کہ اس معاملے میں حزب ولی اللہ کی امتیازی خصوصیات کی پابندی کو قبول نہ کرتے۔ چنانچہ علاوہ معاملہ روز بروز بگڑتا چلا گیا۔

ولی اللہی تحریک کے اس دور میں حنفی فقہ کی پابندی اور عدم پابندی کے مسئلے نے بڑی خطرناک شکل اختیار کر لی تھی۔ اس بنا پر اس تحریک کو ایک طرف افغانوں میں اور دوسری طرف عوام ہندوستانی مسلمانوں میں بھی بڑے زوروں سے بدنام کیا گیا۔ اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے کچھ تفصیل کی ضرورت ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ امام ولی اللہ اگرچہ اپنے والد کی طرح حنفی مذہب کے پابند تھے، مگر وہ حنفی اور شافعی دونوں مذہبوں کی کتابیں تحقیق کی طرح پڑھاتے تھے۔ انہوں نے حجۃ اللہ البالغہ میں اپنے اصول حکمت کے مطابق حدیث کی شرح لکھی ہے۔ اس میں بعض اوقات وہ شافعی مذہب کو اگر وہ حدیث اور حکمت سے زیادہ مطابق ہوتا راجح قرار دیتے ہیں۔

حنفی فقہ کے متعلق شاہ ولی اللہ کا اپنا مسلک بالکل صاف اور واضح ہے۔

"انفاس العارفین" میں وہ اپنے والد کے متعلق فرماتے ہیں "یہ بات محقق ہے کہ حضرت اکثر امور میں حنفی مذہب کے مطابق عمل فرماتے تھے۔ سوائے چند ایک چیزوں کے جن میں وہ حدیث یا اپنے وجدان کی بنا پر دوسرے مذہب کو ترجیح دیتے۔ ان میں سے ایک امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا ہے۔"

اپنی دوسری کتاب "فیوض الحرمین" میں ارشاد فرماتے ہیں:

"میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں توجہ کی اور آپ سے یہ معلوم کرنا چاہا کہ وہ مذاہب فقہ میں کس مذہب کی طرف زیادہ میلان رکھتے ہیں تاکہ اسی کو مضبوطی سے پکڑ لوں۔ چنانچہ مجھ پر یہ کھلا کہ آپ کے نزدیک سب کے سب مذاہب برابر ہیں۔ نیز آپ کی روح اقدس کی اس حالت میں فرمانے کے معلوم

کرنے کا خیال نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حنفی مذہب کا ایک ایسا عمدہ طریقہ بتایا جو ان حدیثوں سے جن کو بخاری اور ان کے ساتھیوں نے جمع کیا اور ان کی چھان پھٹک کی، زیادہ قریب اور موافق ہے۔ وہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد ان تینوں کے اقوال میں سے وہ قول قبول کیا جائے جو حدیث سے زیادہ قریب ہو۔ ان کے بعد حنفی فقہاء میں سے ان کی بات تسلیم کی جائے جو فقہ کے ساتھ ساتھ حدیث کے بھی عالم ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی مسئلے میں امام ابوحنیفہ اور ان کے دونوں ساتھی خاموش رہے ہوں اور حدیث نے اس مسئلہ کی صراحت کر دی ہو تو اس حالت میں ضروری ہے کہ اس مسئلے کو قبول کر لیا جائے اور یہ طریقہ بھی مذہب حنفی میں شامل ہے۔

اس کتاب کے صفحہ ۲۰ پر فرماتے ہیں یہ میرے اوپر ایک اور فیضان ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ تمہارے ذریعہ امت مرحومہ کے شیرازہ کو جمع کرے۔ اس لیے تمہیں چاہیے کہ فروعات میں اپنی قوم کی کبھی مخالفت نہ کرو۔ اگر تم اس طرح مخالفت کرو گے تو گویا اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف چلو گے۔

امام ولی اللہ کی عام دعوت اور ان کے حکیمانہ فکر کے متعلق یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ جہاں تک ذہنی اعتبار سے اس کی تعلیمات و افکار کا سوال ہے، ان کا مخاطب انسانیت کا اعلیٰ طبقہ ہے۔ اور چونکہ وہ تمام دنیا میں ایک ہی رنگ رکھتا ہے، اس لیے شاہ ولی اللہ کی باتیں دوسرے ممالک والے بھی اسی طرح مان سکتے ہیں جیسے ہندوستان والے۔ لیکن امام ولی اللہ نے عملی طور پر اپنی اس عمومی دعوت کو ہندوستان کے لیے خاص کر دیا تھا۔ اسی لیے وہ حجاز چھوڑ کر ہندوستان واپس آ گئے تھے۔ ظاہر ہے ہندوستان میں حنفی فقہ کی پابندی ایک حد تک ضروری تھی۔ امام ولی اللہ کے بعد شاہ عبدالعزیز نے تمام طور پر اپنے

---

۱؎ مولانا محمد فاخر الہ آبادی ایک دفعہ دہلی تشریف لائے۔ شاہ ولی اللہ صاحب سے ملاقات کرنا مقصد تھا۔ اتفاقاً ایک مسجد میں نماز پڑھی اور رفع یدین کر بیٹھے۔ جاہل ان کے سر ہو گئے۔ تو انہوں نے نازک صورت اختیار کر لی۔ یہ ہجوم ان کو شاہ صاحب کی خدمت میں لے گیا۔ آپ نے فرقہ بندی قوم سے نہایت نرمی سے فرمایا کہ احادیث صحیحہ میں اس طرح بھی وارد ہے۔ سارا ہجوم خاموش ہو کر چلا گیا۔ بعد ازاں شاہ صاحب نے مولانا سے فرمایا۔ حکیم وہ نہیں جو عوام کو خود اپنا مخالف کرے۔

ملک کے متوسط طبقے اور جمہور کو مخاطب بنایا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس طرح امام ولی اللہ کے علوم ان کے ذہنوں میں راسخ کر دیں۔ اسی فرق کا نتیجہ ہے کہ شاہ ولی اللہ فقہ حنفی اور فقہ شافعی کو مساوی درجہ دیتے ہیں اور شاہ عبدالعزیز فقہ حنفی سے آگے نہیں بڑھتے۔ لیکن یہ قید صرف مخاطبین کی ضرورت کی وجہ سے تھی جہاں تک اُن کی طبیعت، نیز خصوصی ماحول مثلاً خاندان اور خاص تلامذہ کا تعلق تھا، وہ عملی طور پر اپنے فکر کی بلند سطح سے نیچے اُترنے پر مجبور نہ تھے۔ لیکن ضرورت تھی متوسط طبقہ کو سمجھانے کی، اور ہر ملک کا متوسط طبقہ جدا ہوتا ہے۔ اس لیے شاہ عبدالعزیز کے طریقے میں ملک کے متوسط طبقے کی خصوصیات کا آنا لازمی تھا۔

حنفی فقہ اور فروعات کے معاملے میں ہندوستان کی قومی روایات کے پیش نظر حزب ولی اللہ کا یہ مسلک تھا۔ جب مولانا محمد اسمٰعیل شہید نے حجۃ اللہ[1] امام عبدالعزیز سے پڑھی۔ تو آپ نے جد امجد شاہ ولی اللہ کے طریقہ پر عمل کرنا شروع کیا۔ انہوں نے اپنی ایک خاص جماعت بھی تیار کی جو حجۃ اللہ البالغہ پر عمل کرے۔ یہ لوگ شافعیہ کی طرح "رفع یدین" اور "آمین بالجہر" کرتے تھے، جیسا کہ سنن میں مروی ہے۔ اس سے دہلی کے عوام میں شورش پھیلتی رہی، مگر حزب ولی اللہ کا کوئی عالم مولانا اسمٰعیل شہید اور ان کی جماعت پر معترض نہ ہو سکتا تھا۔ بعد میں جب افغانی علاقہ میں ہجرت کا فیصلہ ہوا تو امیر شہید نے مولانا اسمٰعیل سے دریافت کیا کہ مولانا! آپ "رفع یدین" کیوں کرتے ہیں؟ مولانا نے کہا۔ رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے۔ امیر شہید نے کہا کہ مولانا! اب رضائے الٰہی کے لیے "رفع یدین" کرنا چھوڑ دیجئے۔ اس کے بعد مولانا شہید کی خاص جماعت نے بھی ان کی اطاعت میں یہ اعمال چھوڑ دیئے۔

مگر وہ لوگ جو نجدی اور یمنی علماء کے شاگرد تھے، باز نہ آسکے۔ انہی لوگوں کے بعض افراد نے مشکلات پیدا کر دیں۔ امیر شہید نے ان کے رہنما کو جو مولانا محمد اسمٰعیل اور امام شوکانی دونوں کا شاگرد اور زیدی شیعہ تھا، اپنی جماعت سے نکلوا دیا۔ مگر فساد کی آگ پھر بھی بھڑکتی رہی۔ ولی اللٰہی تحریک کی اس منزل پر نجدی اور یمنی علماء کے ہندوستانی شاگردوں اور حزب

---

[1] یہ روایت میر شاہ خان مرحوم کی زبانی ہم تک پہنچی ہے۔

ولی اللہ میں جو نزاع پیدا ہوا، اس کی ایک اصولی حیثیت اور بھی تھی۔ یہ دراصل اختلاف تھا دو رجحانات میں۔ زمانۂ حال کی اصطلاح میں ایک رجحان نیشنل اور دوسرا تھا انٹرنیشنل۔ آج کل یورپ کی سیاست میں ایک ہی تحریک کی نیشنل اور انٹرنیشنل جماعتوں کے اختلافات مرکزی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ ایک ملک میں ایک نیشنل پارٹی ہوتی ہے، جو انٹرنیشنل رجحانات رکھتی ہے۔ اس کے برعکس دوسری پارٹی انٹرنیشنل نظریہ کو اپنا اولین اساس بناتی ہے۔ عام لوگ تو ان دونوں میں فرق نہیں کرتے مگر یہ جماعتیں آپس میں کبھی مل کر کام نہیں کر سکتیں، بلکہ غالب پارٹی مغلوب جماعت کو قتل کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یوں سمجھنا چاہئے کہ حزب ولی اللہ ایک نیشنل پارٹی تھی جو انٹرنیشنل رجحانات رکھتی تھی اور وہ ہندوستانی جو تجدیدی اور یمنی حیثیت رکھتے ہیں، انکو ایسی پارٹی سمجھنا چاہئے جو انٹرنیشنل نقطۂ نظر کو اساس اولین قرار دیتی ہے۔ افغان قومیں چونکہ خالص نیشنل پروگرام مانتی تھیں، وہ حزب ولی اللہ کے معتدل حلقے سے تو متحد ہو سکتی تھیں، مگر انٹرنیشنل اصول کو اساس اول ماننے والے لوگوں کے ساتھ نہیں مل سکتی تھیں۔

---

ﻟﮧ روس کے اشتراکیوں میں ایک ٹراٹسکی جماعت تھی، جو انٹرنیشنل نظریہ رکھتی تھی، ٹراٹسکی یہودی الاصل تھا۔ اس کے مقابلے میں سٹالن کی جماعت نیشنل پارٹی ہے۔ لیکن انٹرنیشنل میلان رکھتی ہے۔ سٹالن خالص روسی ہے چنانچہ اس کو جب موقع ملا تو اس نے ٹراٹسکی کی ساری جماعت کو جو عموماً یہودی تھے قتل کرا دیا۔ اسی طرح اسلام ایک انٹرنیشنل تحریک ہے۔ اور عربی، ترکی، ایرانی اور ہندوستانی نیشنل تحریکیں ہیں۔ ایک عرب جو اسلامی میلان رکھتا ہے، یا ایک ہندوستانی جو اتحاد اسلام کے فکر کو مانتا ہے، یہ تو مثال ہوگی سٹالن کی۔ ایک ایسا آدمی جو سوائے اتحاد اسلام کے اور کوئی چیز نہیں مانتا جیسے یمنی تجدیدی تحریکوں سے متاثر ہندوستانی، یہ مثال ہے ٹراٹسکی کی۔ کیونکہ وہ اسلام کے علاوہ کسی اور چیز کو نہیں مانتے۔ ہندوستانیت، عربیت وغیرہ ان کے ہاں کوئی چیز نہیں ہے۔ لہٰذا مذکورہ جماعتوں میں یعنی امام عبدالعزیز کی تربیت یافتہ جماعت اور یمنی تجدیدی طریقے پر چلنے والے ہندوستانیوں میں اختلافات کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔

فکری اعتبار سے ایک تو یہ نزاع تھا جو اس وقت ایک طرف افغانوں میں اور دوسری طرف تجدیدی اور دینی ذہنیت سے متاثر ہندوستانیوں میں پیدا ہو گیا۔ لیکن عملی زندگی میں بھی اس کی وجہ سے بعض قباحتیں ظاہر ہوئیں۔ اس میں شک نہیں کہ افغان شرفاء دوسری مسلم قوموں کے شرفاء سے رشتہ ناطہ کرنا معیوب نہیں سمجھتے۔ چنانچہ ہوا یہ کہ ہندوستانی مہاجرین اپنے ساتھ اہل و عیال تو لے نہیں گئے تھے، یہیں سے جب یہ لوگ مستقل طور پر افغانی علاقہ میں رہنے لگے تو ان کی شادی بیاہ افغانوں کے ساتھ ہونے لگے۔ مگر خرابی یہ ہوئی کہ امیر شہید کے وقت خلافت کی اشاعت کرنے والے ہندوستانی اپنی حاکمانہ قوت دکھا کر بہ جبر افغان لڑکیوں سے نکاح کرنے لگے۔ اس بارے میں بھی زیادہ مجرم وہی ہیں جو حزب ولی اللہ کے تربیت یافتہ سپاہی نہیں رہے تھے۔ یہ لوگ مذہبی جوش میں اپنے عقیدہ و فکر کے مقابلے میں امیر کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔ ان لوگوں نے لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِق (جس حکم سے خالق کی نافرمانی ہوتی ہو اس کے بارے میں کسی مخلوق کی اطاعت نہ کرنی چاہیئے۔) کا اصول غلط طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ انکی مثال یورپ کے انارکسٹوں کی سی تھی جو انقلابی جماعت کے ساتھ شریک تو ہو جاتے ہیں لیکن ان سے انقلابیوں کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔

---

ل سنہ ۱۸۳۰ء میں امیر شہید نے ایک خاتون سے نکاح کیا جس کو سلیمان بادشاہ کا شخص نے سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادی سارہ پیدا ہوئی۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد یہ خاتون ٹونک چلی گئیں سنہ ۱۲۸۳ھ میں ٹونک میں وفات پائی تھی۔ مرتب۔ ت افغان لڑکیوں سے بہ جبر نکاح کرنا کا واقعہ سیرت احمدیہ میں ان کو اپنا اصول انقلابی مذکور ہے۔ ہندوستان کے عام مسلمانوں کی طرح افغانستان اور سرحد میں عام رواج تھا کہ بیوگان کا نکاح ثانی ناجائز سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خود نکاح میں اس قسم کی پابندیاں عائد تھیں کہ کنواری لڑکیاں بیٹھے بیٹھے عمر گزار دیتی تھیں۔ سید صاحب نے نکاح بیوگان اور دوسری بری رسموں کے قلع قمع کے لیے حکم دیا۔ اس سے بہت سے خان اور امراء ناراض ہوگئے۔ ان کی مخالفت کے اسباب میں سے ایک یہ بھی بڑا سبب تھا۔ صفحہ ۱۸۱

ت حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے مذاق کے مخالف کوئی حکم بھی ہو اس کو نہیں مانتے۔ خواہ وہ حکم امیر ہی کیوں نہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ جس دن سیّد احمد شہید افغانوں کے امیر بنے۔ اس کے ساتھ ہی اس اجتماع
میں بغاوت کی چنگاری بھڑک اٹھی۔ اگر معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو ہم افغانوں کا امیر ایک افغان
کو بناتے اور یہ افغان امیر شہید کے بورڈ کا ایک ممبر مقرر کر دیا جاتا۔ اس طرح دونوں قومیں مل کر
جہاد کرتیں اور آپس میں مخاصمت پیدا نہ ہوتی۔ ہم نے اپنے اس فکر کا خود عملی تجربہ کر کے دیکھا ہے۔
ہمیں یقین ہے کہ اس سے وہ تمام فسادات رک جاتے، جو امیر شہید کی جماعت کے لیے سوہانِ روح
بنے رہے۔ اپنے زمانۂ قیام کابل میں جب ہم افغانی حکومت کے اندر رہ کر کام کرتے تھے تو ہمارے دوست
باوجودیکہ منافی دونوں قوموں کے تعلیم یافتہ نوجوان تھے ہم نے ان میں اس طرح کے اختلافات پیدا
ہوتے دیکھے، جیسے امیر شہید کے لشکر میں پیدا ہو چکے تھے، ہم نے ان کا انسداد اس طرح کیا کہ افغانوں
پر کسی غیر افغان کو سردار بننے نہ دیا۔ لیکن ان کی تمام ضرورتوں میں ان کے معاون رہے۔ ہم نے ان پر
حکومت نہ کی، البتہ ان کی امداد کرتے رہے۔ اس کی وجہ سے ہمارے سارے معاملات درست رہ سکے۔

سنہ ۱۲۴۲ھ ۱۲ جمادی الثانی کو سیّد احمد کے ہاتھ پر امامت اور خلافت کی بیعت ہوئی اور آپ کے
نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اعلانِ امامت کے چند روز بعد سردارانِ پشاور لشکر اور توپ خانہ لے کر نوشہرہ کے
قریب "سرائے" مقام پر سکھوں[۱] کے خلاف جہاد کرنے کے لیے سیّد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔
ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ اس وقت سردارانِ پشاور، سردارانِ سمہ اور مجاہدینِ ہند کی مجموعی تعداد
ایک لاکھ کے قریب تھی، جو امیر شہید کے حکم پر سر قربانی کرنے کو تیار تھی۔ سردارانِ پشاور گو بظاہر
سید صاحب کے ہمراہ تھے، مگر آپ کی امامت کو اپنی سرداری کے لئے پیامِ مرگ سمجھتے تھے۔ اس بنا پر
وہ سکھوں سے بھی ساز باز رکھتے تھے تاکہ ان کی سرداری بہر حال باقی رہ سکے۔ عین اس وقت جبکہ
میدانِ کارزار گرم ہونے والا تھا اور صفیں آراستہ ہو چکی تھیں، مولانا اسمٰعیل سید صاحب کو لینے کے

---

۱ یہ یاد رہے کہ جب ہم ہندوستان سے نکلے تھے تو اتحادِ اسلام کے حامی تھے یعنی انٹرنیشنل پروگرام رکھتے
تھے۔ مگر جب ہم واپس آئے تو اس وقت خالص نیشنلسٹ تھے۔ یہ سبق ہمیں کابل کی زندگی نے سکھایا ہے۔

جیسے خیمہ میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سید صاحب بیہوش پڑے ہیں اور قے جاری ہے۔ بظاہر
یہ زہر کا اثر معلوم ہوتا تھا جو قے کے ساتھ خارج ہو رہا تھا۔ ادھر جب لڑائی شروع ہوئی تو سرداران
پشاور کے جو دستے پہاڑیوں سے سکھوں پر بندوقوں اور توپوں سے فائر کر رہے تھے۔ افسوس کہ ان
میں خالی بارود بھری جاتی تھی۔ سید صاحب کو میدان جنگ سے لے گئے، زہر کی وجہ سے آپ پر اکثر دو
گھنٹے بیہوشی طاری رہی۔ سازش کے متعلق جب تفتیش شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ زہر کھلانے والے
ولی محمد اور نذر محمد کشمیری شیعہ تھے جو یار محمد خان سردار پشاور کے نوکر تھے اور کھانا پکانے کے لیے
یار محمد نے ان کو امیر شہید کے پاس بھیجا تھا۔ انہوں نے کھچڑی اور گنڈیریوں میں زہر ملا کر سید صاحب
کو عین جنگ کے وقت کھلا دیا۔ امیر شہید نے گرفتاری کے بعد مجرموں کو معاف کر دیا۔ سرداران
پشاور کی غداری کے بعد آپ نے تبلیغ و تالیف قلوب کا سلسلہ وسیع کر دیا، تاکہ عامۃ الناس کے قلوب
کو ادھر مائل کیا جا سکے۔ چنانچہ آپ نے مع فوج کے علاقہ سوات وغیرہ کا دورہ کیا۔[1]

ان فتنوں کے باوجود سکھوں سے بھی لڑائیاں ہوتی رہیں اور مجاہدین کو افغانوں سے بھی لڑنا پڑا۔
ڈمگہ کے مقام پر مولانا شہید کی قیادت میں ہری سنگھ نلوہ کی فوج پر شبخون مارا گیا۔ جس میں تین سو سکھ
اور سات مجاہد کام آئے۔ بعد ازاں جنگ شنکاری واقع ہوئی۔ مجاہدین ڈمگہ جب روانہ ہو چکے اور ابھی باقی
ماندہ حضرات کھانے پینے میں مصروف تھے کہ سکھوں کے بڑے لشکر نے حملہ کر دیا۔ حضرت شہید نے
بارہ آدمیوں کو لے کر ان پر حملہ کیا جس میں تقریباً سو سکھ مارے گئے اور یہ بارہ آدمی سلامت رہے
البتہ مولانا شہید کی انگلی پہ گولی لگی۔[2]

بدقسمتی سے سرداران پشاور کا جذبۂ عناد بڑھتا ہی گیا۔ ایک دفعہ وہ چار ہزار فوج اور دو
توپیں لے کر دریائے لنڈا کو عبور کر کے بمقام اتمان زئی آ پہنچے۔ امیر شہید بمقام پنجتار قیام فرما تھے
سید صاحب نے ارباب بہرام خان، ارباب جمعہ خان وغیرہ خوانین اور صمد دولت کے سرداروں سے

---

[1] شیخ محمد ص ۱۴۱ [2] شیخ محمد ص ۱۴۳

مشورہ کر کے دو جانب سے سرداران پشاور کے لشکر پر شبخون مارا۔ غنیم کو شکست ہوئی۔ اس کے علاوہ خلادی خاں کی بغاوت، اشعد افزالسیمی کی جنگ، جیسے سکھوں نے فوج کی کمان دے کر بھیجا اور اس نے شکست کھائی اور شبخون ہنڈ میں خادی خاں گولی کا نشانہ بنا، وغیرہ اور واقعات رونما ہوئے۔

خادی خاں کے قتل کے بعد اس کے بھائی امیر خاں نے اندرونی طور پر سرداران پشاور (یار محمد خان وغیرہ) سے سازباز شروع کر دی مگر بظاہر وہ سید صاحب کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ یار محمد خاں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر امیر خاں کی ریاست میں اپنے لشکر جمع کرنے شروع کر دیئے۔ اور بعدہ، ایک لشکر جرار مع چھ عدد توپ، ہاتھی اور اونٹ نہایت کروفر سے وہ خود بھی میدان میں آ پہنچا اور اعلان جنگ کر دیا۔ چنانچہ ۱۵ ربیع الاول ۱۲۴۵ھ کو بروز دوشنبہ یار محمد خاں کا لشکر مقام زیدہ پہنچا۔ مولانا محمد اسمٰعیل نے جانبازوں کا لشکر لے کر یکایک ان پر حملہ کر دیا۔ مجاہدین نے ان کی توپوں پر قبضہ کر لیا اور توپچیوں کی مشکیں کس لیں۔ یار محمد خاں عالم بے خبری میں نو گرفتار حسینوں کے ساتھ عیش و طرب میں مشغول تھا۔ وہ زخمی ہوا اور موضع رو ڈھیر میں پہنچنے سے پہلے ہی ہلاک ہو گیا اور پشاور نہ پہنچ سکا۔

یار محمد خاں کی وفات کے بعد اس کا بھائی سلطان محمد خان جوش انتقام سے اندھا ہو گیا اور اس نے قلعہ ہنڈ پر قبضہ کر لیا۔ سید صاحب باوجودیکہ اس وقت سکھوں سے تربیلہ کے مقام پر نبرد آزما تھے، یہ خبر سنتے ہی ہنڈ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سلطان محمد خاں نے سید صاحب کی آمد کا حال سنا تو بھاگ نکلا۔ مگر سکھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور امیر خاں برادر خادی خاں کی انگیخت پر وہ ہنڈ پر قابض ہو گئے۔ اسی زمانے میں ہوتی مردان کا خان مسمی احمد خاں نکاح بیوگان اور دوسری غیر شرعی رسوم کے سلسلے میں جو نکاح کے متعلق افغانوں میں رائج تھیں، سید صاحب سے ناراض تھا۔ یہ شخص سرداران پشاور کے پاس پہنچا اور ان کو بھڑکا کر جنگ کے لیے تیار کیا۔ افغانوں کا یہ لشکر بڑھتے بڑھتے مہیار پہنچا۔ ادھر سید صاحب مولانا اسمٰعیل وغیرہ کے ساتھ خود فوج لے کر میدان میں آ گئے چند گھنٹے کے بعد پشاوری سرداروں کو شکست ہوئی اور وہ لوگ مردوں اور زخمیوں کو چھوڑ کر

بھاگ گئے۔ مایار کی فتح کے بعد ضرورت محسوس ہوئی کہ پشاور کو تسخیر کیا جائے جو ان کا مرکز تھا۔
پشاور کے افغان سردار نے امیر شہید سے لڑ کر شکست کھائی اور مجاہدین کا پشاور پر قبضہ ہو گیا۔ اس کی وجہ سے حزب ولی اللہ ایک صوبہ کی حکومت پر قابض ہو جاتی ہے۔ چنانچہ امام عبدالعزیز کے تربیت یافتہ علماء حکومت کے مناصب پر مقرر کئے گئے۔ ان نواح میں حزب ولی اللہ نے ایسے نمونے کی حکومت قائم کر دی جس کی نظیر دیکھنے کو نہیں ملتی۔ یہ حکومت آگے چل کر باآسانی سندھ تک وسیع ہو کر ماوراء السندھ کو انقلاب کا اپنا مستقل مرکز بنا سکتی تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ شکست خوردہ افغانی خاندان امیر شہید کے پاس تائب ہو کر آیا اور معافی مانگ کر اس نے اپنا ملک واپس لینا چاہا۔ اس پر امیر شہید راضی ہو گئے۔ اس موقع پر جماعت مجاہدین کے خواص و عام سب کے سب متفق الکلمہ تھے کہ یہ فیصلہ غلط ہے۔ مولانا اسمٰعیل ہندوستانی اور افغان اہل الرائے نے پورا زور صرف کیا کہ امیر شہید یہ غلطی نہ کریں مگر انہوں نے کسی کی نہ مانی۔[1]

پشاور کے اس خاندان نے حکومت واپس لیتے ہی افغانوں کے قومی جذبات کو ابھار کر ایسی سازش کھڑی کی کہ ہر ہر قریہ کے لوگوں نے ایک ہی رات میں انقلابی حکومت کے تمام سرداروں اور سپاہیوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اپنے کابل کے قیام کے زمانے میں ہم نے اس فتنہ کے متعلق کافی معلومات حاصل کر

---

[1] شیخ محمد ص ۵۵۱۔ "سوانح احمدیہ" کا مصنف امیر شہید کا خاص دلدادہ ہے۔ مگر یہاں پہنچ کر اس نے واقعات نہیں چھپائے۔ امیر شہید پر جماعت نے جس قدر زور دیا سب کو اس نے مفصل لکھ دیا ہے۔ بہرام خان افغان ہندوستانی تھا اس نے امیر شہید سے کہا کہ اگر آپ حکومت نہیں چلا سکتے تو مجھے امیر بنا دیجئے میں اپنی قوم کے زور سے ان خائنوں سے بدلہ لے لوں گا اور مجاہدین کے کام میں آپ جس قدر امداد میرے ذمے لگائیں گے میں اسکو پورا کروں گا۔ بہرام خان نہایت مخلص متقی تھا۔ وہ اپنی قومی طاقت رکھتا تھا اور مولانا شہید کا خاص رفیق اور دینی دوست تھا۔ بقول مؤلف سوانح احمدیہ امیر شہید نے اسکی بھی نہ سنی۔ اول تو افغانوں سے ہرگز لڑنا نہیں چاہئے تھا اور جب لڑ کر مرکز فتح کر لیا تھا تو واپس دینا بہر صورت غلط تھا۔ یہ ایسی غلطی ہے کہ کوئی اہل الرائے اس کو معاف نہیں کر سکتا۔

لی ہیں۔ اس فتنہ کی ابتداء خویشگی کے آزی خان سے ہوئی ہے، جس کی لڑکی کا جبراً نکاح ہوا تھا اس میں سب سے آگے آگے خٹک کا خان تھا جس سے خویشگی خان نے صلح کر لی تھی۔

واقعات یوں ہیں کہ ان ہر دو خوانین کی باہمی پشتینی دشمنی تھی۔ لیکن جب خویشگی کے خان کی لڑکی کا ایک ہندوستانی سے جبراً نکاح کیا گیا تو اس نے خان خٹک سے کہا کہ میں نے اب اپنا دعویٰ چھوڑ دیا ہے۔ اب سوال ننگ افغانی کا ہے۔ ہماری اب باہمی صلح ہے۔ تم میری مدد کرو۔ خان خٹک کی نوجوان لڑکی تھی یہ پیغام پہنچتے ہی اس نے اپنی دوشیزہ لڑکی کو مجلس میں بلایا۔ سر دربار اس کے سر سے کپڑا اتار دیا اور کہا آج سے تیری کوئی عزت باقی نہیں رہی جب تک اس افغان لڑکی کا انتقام نہیں لیا جاتا تیری عزت ننگی ہے۔ اس کے بعد خان خٹک کی یہ لڑکی اس فتنہ کے خاتمے تک ننگے سر رہی۔ چنانچہ یہ لڑکی رات کو ایک جماعت اس کے ساتھ جاتی اور ایک گاؤں میں عورتوں اور مردوں کو جمع کر کے پشتو میں ننگ افغانی کے نام سے لوگوں کو بھڑکاتی۔ دوسری رات یہ دوسرے گاؤں میں جاتی۔ اس طرح اس نے تمام افغانی علاقہ میں شورش برپا کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک معین رات میں امیر شہید کے تمام مقرر کردہ اہل مناصب افغانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ اور اس انقلابی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔[1]

---

[1] پشاور کے عوام سلطان محمد خان سردار پشاور کی عیاشی سے متنفر تھے۔ سب نے سید صاحب کو سر آنکھوں پر رکھا۔ سابقہ جنگوں میں شکست اور سید صاحب کی اسلام پر بڑھتی ہوئی عقیدت نے سلطان محمد خان کی ہمت پست کر دی۔ اس نے ارباب فیض اللہ خاں مہمند کے ذریعے توبہ کی درخواست کی۔ جماعت کی مرضی کے خلاف آپ نے یہ درخواست قبول فرمائی۔ اب حاکم پشاور کے انتخاب کا مسئلہ پیش ہوا۔ اس موقع پر ارباب بہرام خان وغیرہ نے خود اپنے لیے درخواست کی مگر سید صاحب نے پشاور کی حکومت اور ولایت کو سلطان محمد خاں کو واپس کر کے پشاور کا حاکم بنا دیا۔ سید صاحب نے مولانا سید مظہر علی کو شہر کا قاضی مقرر کیا اور مولانا قمر الدین کو مع چند مجاہدین کے اُن کی مدد کے لیے پشاور میں چھوڑا۔ اب سید صاحب مع مجاہدین کے بعد حکومت پر جو کے پڑے علاقہ پر پہنچے ہوں گے کہ اس کے بعد سلطان محمد خاں نے غداری کر کے سب سے پہلے قاضی مذکور کو مع ارباب فیض اللہ خاں کے قتل کرا دیا۔ فیض اللہ خان وہی ہے جس نے سلطان محمد خان کی توبہ منظور کرائی تھی۔ ایک رات شہر میں سے ڈھونڈ کر مجاہدین پر اور قریب قریب تمام علاقوں میں

(باقی اگلے صفحہ پر)

امیر شہید اس واقعہ سے کہ ان کے مقرر کردہ قاضی، مفتی، عالم، یہی بغرض اُن کی سی فراج کی ساری
جماعت قتل کر دی گئی تھی بہت متاثر ہوئے۔ لہٰذا موصوف نے بجائے مرکز کشمیر میں منتقل کرنے کا فیصلہ
کیا۔ بالاکوٹ راستہ کی ایک منزل تھی یہاں سکھوں کے ولی عہد سلطنت شیر سنگھ نے مجاہدین کی جماعت پر حملہ
کر دیا۔ مجاہدین اپنے میدان میں گھر چکے تھے کہ کوئی کارگر کوئی صورت باقی نہ رہ گئی کوئی بچ کر جان نہ بچا سکا۔ تحقیق سے
یہی ثابت ہوتا ہے کہ امیر شہید کا سر کاٹ کر رنجیت سنگھ کو دکھانے کے لیے لاہور لایا گیا اور جسم مبارک بے سر
کا جنازہ مولانا اسمٰعیل شہید کے جنازہ کے ساتھ بالاکوٹ میں دفن ہوا۔

شیخ محسن نے اپنی کتاب "الیانع الجنی" میں بڑی تفصیل سے اس واقعہ کو بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے
ہیں:

"مجاہدین کے قتل عام کے بعد سید صاحب نے ارادہ کر لیا کہ اس بدنصیب سرزمین سے ہجرت کر جائیں
اس وقت جس قدر مجاہدین وہاں موجود تھے ان کے روبرو آپ نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اب
اس سرزمین کو چھوڑنا چاہتا ہوں، نہیں بتا سکتا کہ کہاں جاؤں گا۔ میں آپ کو رخصت دیتا ہوں آپ مجھے
رخصت دیں۔ مجاہدین نے کہا ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اس پر آپ نے کشمیر کی جانب کوچ کا حکم دیا
یہ واقعہ ماہ رجب ۱۲۴۶ھ کا ہے۔ پکھلی اور سمہ کے مخلص عقیدت مند کئی منزل تک آپ کے ساتھ تھے
سید صاحب کاغان میں پہنچے۔ وہاں سے آپ نے چار سو مجاہدین کا لشکر بہ قیادت مولانا شہید اور
مولانا خیر الدین شیرکوٹی [illegible] تک روانہ کیا۔ یہاں شیر سنگھ بیس ہزار فوج کے ساتھ مال گزاری وصول
کرنے کے لیے پڑا ہوا تھا۔ مجاہدین کا شبخون کامیاب رہا اور وہاں کے لوگوں نے سکھوں کے بجائے
مجاہدین کو مالیہ ادا کیا۔ یہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ [illegible] مولانا اسمٰعیل شہید نے

---

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ) منقول آگے [illegible] جا رہی ہے اور لوگ خوشیاں منا رہے ہیں۔ مجاہدین نے اس کا سبب دریافت
کیا تو بتایا گیا کہ یہ سب سرکاری مالیہ کی ادائیگی کی تیاری ہے۔ تاکہ فصل صاف کر کے گھاس [illegible] کیا جائے۔ لیکن موقعہ
یہ بات کہیں رات کی نماز کے وقت کہیں نصف شب کے وقت کہیں صبح کی نماز کے وقت تمام مجاہدین کو
تمام دیکھ کر ذبح کر دیا گیا۔ شیخ محسن ص ۸۱

بالاکوٹ پر قبضہ کر لیا۔ ان ایام میں شیر سنگھ سردار نجف خاں رئیس مظفر آباد کے ساتھ نپٹنے گیا ہوا تھا مظفر آباد میں سکھوں کا فوجی ہیڈ کوارٹر تھا۔[1]

مولانا اسمٰعیل شہید نے خیر الدین، ملا قطب الدین اور منصور خاں قندھاری کو فوج دے کر مظفر آباد روانہ کیا۔ خونریز جنگ کے بعد مظفر آباد فتح ہوا۔ شیر سنگھ کو جب اس کی اطلاع پہنچی تو وہ گڑھی حبیب اللہ آیا جو مظفر آباد اور بالاکوٹ کے درمیان ہے۔ بالاکوٹ گویا ایک قدرتی قلعہ ہے، جس کو چاروں طرف سے بلند پہاڑیوں کی دیواروں نے گھیر رکھا ہے۔ ایک بدبخت مسلمان کی رہنمائی سے شیر سنگھ دشوار گزار رستوں کو پھلانگتا ہوا ایسے مقام پر پہنچا جہاں صرف مٹھی بھر مجاہد پہرہ دے رہے تھے ان سب کو شہید کر کے شیر سنگھ کی بیس ہزار فوج ایک محصور مقام پر ہزار بارہ سو کی جماعت سے نبرد آزما ہوتی ہے۔ نشیبی علاقہ میں مجاہدین تھے۔ اور بلندیوں پر سکھ۔ دست بدست لڑائی کے علاوہ سکھوں کی بھاری جمعیت پہاڑوں سے گولیوں کی بارش برسا رہی تھی۔ سید صاحب، مولانا شہید، ارباب بہرام خاں اور دوسرے مجاہدین سکھوں کی فوج میں گھس گئے اور سب نے جام شہادت نوش کیا۔ یہ واقعہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء بروز جمعہ نماز جمعہ کے وقت کا ہے۔ شہادت کے وقت سید صاحب کی عمر ۴۴ سال کی تھی اور مولانا شہید کی عمر ۴۵ سال کی تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حکیم الہند امام ولی اللہ نے جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں ۶ مئی ۱۷۳۱ء کو اپنا کام شروع کیا تھا جب اس تحریک پر پورے سو برس گزر چکے تو امام ولی اللہ کے بے نظیر پوتے اور ان کے رفقاء نے اس طرح معرکۂ کارزار میں شہید ہو کر تحریک کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ واقعہ ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو پیش آیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی گزشتہ ڈیڑھ سو برس سے ہندوستان میں سیاسی

---

[1] شیخ محمد صفحہ ۱۴۴

اقتدار حاصل کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ مگر اب تک اس نے تجارتی لباس میں مستور رہنا ضروری سمجھا تھا۔ اس واقعہ سے قریب تین سال بعد ۱۸۳۳ء میں یہ کمپنی تجارت کا لبادہ اتار کر حکومت کی مالک بن جاتی ہے

فی ذالک لعبرۃ لاولی الالباب۔

اس تحریک کے متعلق ہم نے کتاب "المسویٰ" کے مقدمہ میں زمانۂ قیام مکہ میں ایک حاشیہ لکھا تھا اسے یہاں نقل کر دینا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ "المسویٰ" کا یہ نسخہ مکہ معظمہ میں طبع ہو چکا ہے۔

امام عبد العزیز کی تحریک ترقی کرتے کرتے ۱۲۴۴ھ میں اس قابل ہوگئی کہ اس نے مجاہدین کی سرحد پر افغانوں کے کوہستانی علاقہ میں اپنی موقتہ حکومت قائم کر لی۔ اس حکومت شرعی کی قیادت امیر المومنین سید احمد دہلوی (امیر شہید) کے سپرد ہوئی۔ صدر نمبر ا مولانا عبد الحی دہلوی (صدر سعید) ہے۔ جنگی و سیاسی امور مولانا محمد اسماعیل دہلوی (صدر شہید) کی تحویل میں تھے۔ باقی رہے امور و انتظام مثلاً اموال کی فراہمی اور مجاہدین کی روانگی وغیرہ۔ انتظام کر رہا تھا۔ مولانا محمد اسحاق (صدر حمید) اس کے نگران تھے۔ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ آخر مئی ۱۸۳۱ء بالاکوٹ کے مقام پر جو کشمیر کی حدود کے قریب واقع ہے امیر اور ان کے ساتھی شہید ہوگئے۔" راقم عبید اللہ بن الاسلام سندھی دیوبندی۔ و آخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔

ہمارے نزدیک مرحوم کی حکومت موقتہ کا قیام در اصل امام عبد العزیز ہی کی تحریک کا نتیجہ تھا۔ بعض حلقوں کی طرف سے سید صاحب کو بڑی کشف و کرامت کا مالک بنا کر ساری جماعت کا امام بتایا گیا ہے۔ یہ چیز حقیقت کے سراسر خلاف ہے۔ یہاں کشف و کرامت کا ذکر ہی کیا ہے جماعت نے

---

لے دو سال تک یہ لوگ انتظار میں رہے کہ آیا یہ تحریک پھر اٹھتی ہے یا نہیں۔ جب دیکھا کہ تحریک قطعاً ختم ہو چکی ہے تو انہوں نے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ اصل عبارت عربی میں تھی۔ گو ہجری مہینے کی تاریخ مشکوک ہے۔ انگریزی جنتری کے ساتھ تطبیق دے کر پیچھے ہم نے بھی ۱۸۳۱ء درج کیے تھے مگر دوسری جنتری کی مدد سے درستی ہوتی ہے۔

بصل امام عبدالعزیز تھے۔ سید صاحب تو امام عبدالعزیز کی جماعت کے سپاہی تھے۔ بے شک وہ قومی
جرنیل کے فرائض اچھی طرح ادا کر سکتے تھے۔ ان سے غلطی ہوئی۔ خدا تعالیٰ انہیں معاف کرے۔ ہم تو تحریک
سے اصل شاہ عبدالعزیز کو مانتے ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ سید صاحب کی زندگی میں مولانا عبدالحی اور مولانا
محمد اسمعیل کا اشتراک ہے۔ کیا ان کو سید صاحب نے تیار کیا تھا؟ ہرگز نہیں۔ یہ لوگ تو امام عبدالعزیز
کے تربیت یافتہ تھے۔ سید صاحب کو روپیہ شاہ اسحاق بھیجتے تھے۔ کیا ان کو سید صاحب نے تیار کیا

---

تحریک کے دُعاۃ کا انتظام شروع سے آخر تک مولانا اسحاق کے ہاتھ میں رہا۔ سوانح احمدیہ کے مصنف نے
امیر شہید کے مناقب اس طرح بڑھا چڑھا کر لکھے ہیں کہ مولانا محمد اسحاق کی شخصیت گم ہو گئی ہے۔ اس کا
اصلی سبب یہ ہے کہ مولانا ولایت علی نے مولانا محمد اسحاق کے بالمقابل اپنی پارٹی بنائی۔ اور سوانح احمدیہ
کا مصنف اس پارٹی سے تعلق رکھتا ہے مگر پھر بھی اس کے قلم سے بعض واقعات ایسے نکل گئے ہیں
جن سے ہمارے مطلب پر روشنی پڑتی ہے۔ مولانا محمد اسحاق نے ایک ہنڈی پانچ ہزار کی بھیجی۔ وہاں وصول نہ ہو
سکی۔ اس کی بازیافت کے لیے سیٹھ پر عدالت عالیہ آگرہ میں دعویٰ کیا گیا اور ڈگری مولانا محمد اسحاق کے
نام ملی۔ مؤلف سوانح احمدیہ نے یہ واقعہ اس لیے لکھا کہ یہ تحریک برطانوی گورنمنٹ کے خلاف نہ تھی۔
براہ دوراندیشی شیخ غلام علی رئیس اعظم الٰہ آباد کی معرفت گورنر اضلاع شمالی و مغربی کو اس تیاری جہاد کی
اطلاع دی گئی جس کے جواب میں گورنر نے لکھا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی نقض کا اندیشہ
نہ ہو ہم ایسی تیاری سے مانع نہیں۔ مذکورہ بالا دو واقعہ سوانح احمدیہ میں موجود ہے۔ ہم اس ایک واقعہ کو
کافی سمجھتے ہیں۔ اگر روپیہ روانہ کرنے کا انتظام شاہ اسحاق کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو عدالت میں یہ دعویٰ کس طرح کر سکتے
تھے اور ڈگری کس طرح لے سکتے تھے۔

ایک واقعہ اور ہے۔ مولانا محبوب علی مجاہدین کے مرکز سے مرتد ہو کر واپس آئے تو شہر میں انہوں نے اس تحریک کے خلاف پروپیگنڈہ
شروع کر دیا کہ یہ تحریک جہاد ہرجہت سے بے سود اور غلط اقدام ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ سوانح احمدیہ کا مصنف لکھتا ہے کہ مولانا
محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب کی کوششوں سے یہ فتنہ دب گیا۔ اور وہ اثر زائل ہو گیا۔ اور قافلوں کی روانگی باقاعدہ شروع ہو گئی۔

تھا۔ یہ سارا کام امام عبدالعزیزؒ کا تھا انہوں نے آدمی تیار کئے، پروگرام بنایا اور کام شروع کیا۔ پھر غلطیاں اس قدر ہوئیں کہ ان کا لازمی نتیجہ شکست تھا۔ پہلے زمانے میں ہم ان واقعات کو پڑھ کر رو لیتے اور زمانے کی شکایتیں کرتے کہ لوگ اسلام سے بہت دور ہو گئے ہیں۔ مگر بعد میں یورپ کی انقلابی تحریکوں کی تاریخ پڑھنے سے ہمارے تمام خدشات رفع ہو گئے۔ ہم نے دیکھا کہ اس طرح کی انقلابی تحریکیں ؎ بار بار شکست کھاتی ہیں تب کہیں برگ و بار لاتی اور اپنی منزل مقصود پر پہنچتی ہیں۔

بہرحال یہ ایک حقیقت ہے کہ واقعہ بالاکوٹ پر امام ولی اللہؒ اور امام عبدالعزیزؒ کی اجتماعی تحریک کا ایک دور ختم ہو گیا۔ لیکن چالاک تاریخ نویس اس واقعہ کو خود تحریک کا خاتمہ قرار دے کر امام ولی اللہؒ اور امام عبدالعزیزؒ کے کاموں کو یہاں ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ پہلے تو شہیدین کی عظمت پر زور دے کر ان کو ساری تحریک کا ماں باپ ثابت کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس تحریک کی اس قدر کامیابی میں نہ امام عبدالعزیزؒ کا دخل تھا اور نہ امام ولی اللہؒ کا۔ اور نہ پشاور کی حکومت مؤقتہ کو دہلی میں مولانا محمد اسحاقؒ کی امامت یا صدارت سے جو روپیہ اور مجاہدین پہنچانے کی ذمہ داری تھی، کوئی تعلق تھا۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ آسانی سے امیر سید احمدؒ کی شہادت سے اس تحریک کے ختم ہونے کا نتیجہ نکال سکتے ہیں۔

؎ سوشلسٹ انقلابی تحریک سب سے پہلے فرانسیسی انقلاب کے موقع پر شروع ہوئی اور ٹوٹ گئی۔ پھر دوسری بار منظم ہوئی اور شکست کھا گئی۔ بعد ازاں روس میں لینن نے اس کو تیسری بار منظم کیا اور اس کا نام اسی مناسبت سے تھرڈ انٹرنیشنل تجویز ہوا۔ کارل مارکس کے اصل نظام اور لینن کے موجودہ نظام میں بہت کچھ تبدیلی آچکی ہے۔ مگر وہی تحریک اپنے تیسرے دور میں کامیاب ہو کر روس اور زمین کے ایک بڑے قطعہ پر اپنی حکومت قائم کر سکی۔

ہم ولی اللہی تحریک کے اس سلسلے کو زندہ مانتے ہیں اور یہ مولانا شیخ الہند کی صحبت کا خصوصی فیض ہے۔ مولانا شیخ الہند کی صحبت میں رہ کر ہم اس تحریک کے خفیہ کاموں سے کافی واقفیت رکھتے ہیں۔

کہتا ہے: "اس نظام کو اور زیادہ مستحکم بنانے کے لیے مولانا محمد اسحاق نے ترکی خلافت سے اشتراک ضروری سمجھا اور وہ اپنا مرکز مکہ معظمہ میں لے گئے۔ ظاہر ہے ان کے نزدیک اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ترکی سلطنت کے اتصال سے ہندی اور سندھی تحریکیں دوبارہ معاملہ بگاڑ نہیں سکیں گی۔

مولانا محمد اسحاق مکہ معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب دہلوی کو اپنے ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا مملوک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلوی، مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی دہلوی کو ملا کر ایک بورڈ بنا دیا جو اس نئے پروگرام کی اشاعت کرے گا۔ یہ سب سے پہلا جماعتی نظام پیدا کرنے کی جماعت ہے جو آگے چل کر دیوبندی نظام بنتا ہے۔ الغرض امام ولی اللہ کی اجتماعی تحریک کو نتیجہ پر پہنچانے میں شاہ محمد اسحاق کی اس اصابت رائے کا نتیجہ تھا کہ بعد میں دہلی کے مدرسہ کے نمونہ پر دیوبند میں جو درسگاہ قائم کی گئی اس نے پچاس سال کے عرصہ میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔

دیوبندی نظام اور اس کی سیاسی مصلحتوں کو سمجھنے کے لیے اس حقیقت کو مستحضر کر لینا چاہیے کہ جس دیوبندی جماعت کا تعارف ہم کرانا چاہتے ہیں وہ اس دہلوی جماعت کا دوسرا نام ہے جو مولانا محمد اسحاق کی ہجرت کے بعد ان کے متبعین نے ان کی مالی اعانت اور ان کے افکار کی اشاعت کے لیے بنائی تھی۔ اس جماعت کی صدارت سب سے پہلے استاذ الاساتذۃ الشیخ مولانا مملوک علی صدر مدرس گورنمنٹ کالج دہلی کے لیے مخصوص رہی۔ ان کے بعد مولانا محمد اسحاق نے مولانا امداد اللہ کو اس کام کے لیے مقرر کیا۔ مولانا محمد اسحاق نے مکہ معظمہ پہنچ کر پوری آزادی سے اپنی ہندوستانی تحریک کی رہنمائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس پر دولت عثمانیہ کی وزارت خارجہ کو ان کے افراج

---

۱؎ شاہ محمد اسحاق کے متبعین میں تو اس قسم کا پانے عوام سے کہتے کہ یہ چھوٹا نفلی ہے۔ یہ جملہ دراصل امیر شہید کا بنایا ہوا ہے۔ مگر کثرت سے اس کا استعمال شاہ محمد اسحاق کے متبعین نے کیا۔

ایک اختلاف رونما ہوا اور یہ جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ بعد میں اس جماعت کے دہلی کے ایک مرکز کے بجائے دیوبند اور علی گڑھ دو مرکز بن گئے۔ مولانا محمد قاسم دہلی کالج کے عربی حصہ کو دیوبند لے گئے اور سر سید[1] احمد خاں نے دہلی کالج کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ پہنچا دیا۔ کالج پارٹی انگریزی حکومت کے ساتھ پورا اشتراک کئے بغیر اپنا کام شروع نہیں کر سکتی تھی، اس لیے اس نے گورنمنٹ کی وفاداری کو اپنی سیاسی مصلحت کا جزو بنا لیا۔ مگر دیوبندی جماعت جو مولانا محمد اسحاق کے زمانے سے دولتِ عثمانیہ کو اپنا سیاسی رہنما مان چکی تھی، اضطراری حالات کے سوا حکومت کی کامل وفاداری کا اعلان نہ کر سکتی تھی۔ اس نے معتدل حالات میں تو برطانوی سیاسی مصالح سے غیر جانبداری کو اپنا مسلک بتلایا۔ لیکن طے یہ پایا کہ جب بھی دولتِ عثمانیہ اور دولتِ برطانیہ میں لڑائی ہو تو اس وقت دیوبندی جماعت کی یہ غیر جانبداری بھی قطعاً ختم کر دی جائے گی۔

ہم مولانا محمود حسن شیخ الہند کو اپنے مشائخ اربعہ مولانا امداد اللہ، مولانا محمد قاسم، مولانا محمد یعقوب دیوبندی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کا جانشین مانتے ہیں۔ ہم اٹھارہ سال تک ان کی صحبت خاصہ میں رہ کر ان کے سیاسی مسلک کو سمجھتے اور پھر اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں چنانچہ جس قدر ہم دیوبندی مسلک کو سمجھ سکے، اس کا خلاصہ ہم نے اپنے الفاظ میں لکھ دیا ہے۔ — واللہ المستعان۔

بالاکوٹ میں امیر شہید اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کے بعد امام عبدالعزیز کی مرکزی جمعیت کا کوئی رکن بجز الصدر الحمید مولانا محمد اسحاق دہلوی کے باقی نہیں رہا۔ انہوں نے جیسا کہ پہلے بیان

---

[1] سر سید احمد خاں ہمارے اساتذہ الہند مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے۔ مولانا مملوک علی نے شیخ رشید الدین سے علم حاصل کیا تھا اور وہ خود شاہ عبد العزیز کے شاگرد تھے۔ آپ نے شاہ صاحب سے طریقہ تحریر سیکھا اور اس میں کمال حاصل کیا۔ نیز شاہ عبد القادر اور مولانا عبد الحی سے بھی پڑھا۔ لیکن زیادہ تر شاہ رفیع الدین کی خدمت میں رہے۔ الغرض سید احمد دہلوی جو علی گڑھ دار العلوم کے بانی ہیں، ولی اللّٰہی ہیں۔

کیا جا چکا ہے، حقیقت حال سے واقف ہو کر اپنے رفقاء کے ساتھ مشورہ کیا اور تحریک کی بقاء کے لیے راستہ بنایا۔ اور اپنی عقل اور ہمت کے مطابق تحریک کو اس پر چلایا۔ خدا نے ان کی کوششوں کو قبول فرمایا۔ ان میں برکت دی۔ ان کے پیرو جیسے جیسے حالات پیش آتے گئے اپنے قدم آگے بڑھاتے گئے۔ اس جماعت نے تقریباً سو سال تک اسی راستے پر چلنے کی محنت برداشت کی اور اسی کا عملی نتیجہ دیوبندی نظام کی صورت میں نکلا۔

لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ دہلی سے باہر جس قدر جماعتیں حزب ولی اللہ سے تعلق رکھتی تھیں، ان سب نے مولانا محمد اسحاق کی رہنمائی پر اتفاق کر لیا۔ بلکہ ہمیں یہ تلخ حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی کہ بالاکوٹ کی یہ مصیبت عظمیٰ اپنے پیچھے اپنی مستقل یادگار چھوڑ گئی اور وہ تھا جماعت میں اتفاق و اختلاف۔ اس کے بعد حزب ولی اللہ دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئی۔ ہم دہلوی (دیوبندی) جماعت کے حالات جس تفصیل سے جانتے ہیں، اس قدر چند یعنی صادق پور کی تحریک سے آشنا نہیں، بہرحال تکمیل بحث کے لیے ہم یہاں صادق پوری جماعت کے مجمل حالات بیان کرتے ہیں۔

واقعہ بالاکوٹ میں بقیۃ السیف مجاہدین کو امیر شہید کا جنازہ نہ ملا۔ بیان یہ ہوتی ہے کہ سکھوں نے امیر شہید کا سر کاٹنے کے بعد آپ کو مقامی مسلمانوں کی معرفت فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کرا دیا۔ مجاہدین کے ذہن سے شکست فاش کا تصور کوسوں دور تھا۔ اس لیے حالت اضطراب میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو امیر کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض اتفاقی واقعات بھی اس کے مؤید بن گئے۔ امیر شہید نے بالاکوٹ کے واقعے سے چند روز بیشتر اپنے اصحاب کو یہ وصیت

---

لے سکھوں کا سالار جنازہ کے ساتھ تھا۔ شیر سنگھ نے اپنا قیمتی دوشالہ جنازہ پر ڈال دینے کے بعد مقامی علاقوں سے جنازہ کی نماز پڑھوائی اور فوجی اعزاز کے ساتھ انہیں دفن کرایا۔ لیکن مجاہدین اس وقت سخت پریشانی اور آشفتہ دماغی کا شکار ہو رہے تھے کیونکہ امیر مع اپنے معتمدین کے شہید ہو چکے تھے اس لیے اگر ان کو اس اعزاز اور دفن کا واقعہ معلوم نہ ہو تو چنداں بعید نہیں۔

فرمائی تھی کہ اگر بالفرض ہم کسی ضرورت کے لیے چند روز غائب ہو جائیں تو آپ لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنے کام پر مستقل طور پر قائم رہیں۔ درحقیقت وہ ان اشاروں اور کنایوں سے پیش آنے والے واقعات کے لیے ذہنوں کو تیار کر رہے تھے، مگر پریشان دماغی اس قدر سوچنے کا کب موقع دیتی ہے۔ اس طرح یہ روایت کہ امیر کہیں غائب ہو گئے ہیں، پیدا ہو گئی اور مخالفوں نے اسے سارے ہندوستان میں پھیلا دیا تاکہ تحریک اپنے عمل کے اعتبار سے ختم ہو جائے۔

پٹنہ کے مولانا ولایت علی معرکہ بالاکوٹ میں موجود نہ تھے۔ موصوف مولانا اسمٰعیل شہید کی اس جماعت کے خاص رکن تھے جو مولانا شہید نے حجۃ اللہ پڑھنے کے بعد اس پر عمل کرنے والی ایک جماعت بنائی تھی۔ یہ لوگ رفع یدین اور آمین بالجہر کیا کرتے۔ لیکن ہجرت کے موقع پر امیر شہید کے سمجھانے سے مصلحت عامہ کے پیش نظر اس جماعت کو ختم کر دیا گیا تھا۔ چنانچہ اب مولانا ولایت علی نے اس جماعت کے احیاء کو اپنا مقصد بنایا اور آپ نے مولانا محمد اسحاق کے اصلاحی[1] فکر کو قبول نہ کیا۔

مولانا ولایت علی نے امیر شہید کے غائب ہونے کی روایت کی آڑ میں اپنی مستقل جماعت بنانے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے حجاز کا سفر کیا اور یمن و نجد کی عربی تحریکوں کے مطالعہ کے سلسلے میں ان ممالک کی بھی سیاحت کی۔ ان کے نزدیک ترکوں سے اتصال کے بجائے عربی تحریک سے اتصال زیادہ محبوب تھا۔ الغرض مولانا محمد اسحاق کے حجاز جانے کے بعد مولانا ولایت علی نے پٹنہ میں اپنی مستقل پارٹی کا اعلان کر دیا۔ اس کے خلاف چونکہ مولانا اسحاق نے حزب ولی اللہ کے کام چلانے کے لیے دہلی میں جو انتظام کیا تھا اسے آپ کمپنی کے کارندوں سے محفوظ رکھنا ضروری سمجھتے تھے، اور اسی غرض کے پیش نظر انہوں نے اپنا مرکز مولوی مملوک علی کے حوالہ کیا تھا جو ایک سرکاری ملازم تھے اور آپ

---

[1] اصلاحی فکر یعنی حنفی مذہب کی پابندی اور ترکوں سے اتصال۔ وہ حنفی مذہب کی پابندی کو حجۃ اللہ کے خلاف اور ترکوں سے اتصال کو مقلدوں اور بدعتیوں کے طرف جانتے تھے۔

نے اپنے خاص اصحاب کی جماعت کو اُن کے تابع کر دیا تھا۔ یہ سبب تھا جس کی وجہ سے شاہ محمد اسحاق کی جماعت کے مقابلے میں مولانا ولایت علی کی پارٹی اس وقت زیادہ نمایاں طور پر ہو گئی۔ وہ ہندوستانی عالم جو کہ مذہباً زیدی شیعہ تھا اور امیر شہید نے اسے اپنی جماعت سے نکلوا دیا تھا، وہ بھی مولانا ولایت علی کے ساتھ شامل ہو گیا۔ نواب صدیق حسن خان اسی استاد کے توسط سے امام شوکانی کے شاگرد ہیں۔ نیز مولانا نذیر حسین دہلوی اور عبداللہ غزنوی بھی مولانا ولایت علی کی پارٹی سے خاص تعلق رکھتے تھے۔

مولانا ولایت علی کی پارٹی کا مرکزی فکر یہ بتلایا جاتا ہے کہ امیر شہید غیر معین عرصہ کے لیے غائب ہو گئے ہیں۔ ان کے انتظار میں جہاد کی تیاری کرتے رہنا چاہیے۔ وہ ضرور آئیں گے اور انہی کی امامت میں کام کرنے سے ہمیں نجات مل سکتی ہے۔ بظاہر یہ فکر نہایت غیر معقول معلوم ہوتا ہے۔ مگر بڑے بڑے عالموں اور صوفیوں کا جو حزب ولی اللہ سے اختصاص رکھتے ہیں، اس تحریک کی شمولیت کے سلسلے میں نام لیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کی تاویل یہی ہو سکتی ہے کہ عوام (نہ کہ خواص) کو اس تحریک کے ساتھ وابستہ رکھنے کے لیے یہ ایک سیاسی چال تھی۔

مولانا ولایت علی نے ہندوستان کے مشرقی حصے پر اپنا اثر قائم کیا اور سرحد کے افغانی پہاڑوں

---

لہ بظاہر مولانا محمد اسحاق ہندوستانی کام چھوڑ گئے تھے اور ان کے بجائے مولانا ولایت علی نے کام سنبھال لیا تھا مگر درحقیقت مولانا محمد اسحاق نے حجاز میں وہی کام کیا، جو وہ دہلی میں کیا کرتے تھے۔ لہ نواب صدیق حسن خان حجج الکرامۃ میں لکھتے ہیں: عظیم آباد (پٹنہ) اور بنگال کی ایک بڑی جماعت سید احمد مرحوم بریلوی کے بارے میں یہی گمان رکھتی ہے کہ وہ مہدی تھے۔ چنانچہ مرحوم کے بعض مریدوں نے چالیس حدیثیں جمع کی ہیں جن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ ہی مہدی تھے۔ یہ لوگ سید احمد مرحوم کے غائب ہونے کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ سرحد کے پہاڑوں میں شہید نہیں ہوئے۔ اسی بنا پر ان کے واپس آنے کے منتظر ہیں۔ یہ بڑی بھاری غلط فہمی ہے۔ اگر سید مرحوم نے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور دوبارہ آنے کا کب کہا تھا۔ بالفرض محال اگر وہ ایسا کرتے بھی تو کوئی انکی تصدیق نہ کرتا (مولانا سندھی کی کتاب التمہید کے مسودہ سے)

میں اپنا مستقل مرکز بنایا۔ ان کی اولاد اب تک اسی علاقہ میں چھوٹی سی امارت اور اپنا مرکز رکھتی ہے۔ ان کے مخالفوں کو بھی ماننا پڑتا ہے کہ وہ ایک چھوٹے پیمانہ پر امیر شہید کی حکومت شوکت کی یادگار ہے۔ مولانا ولایت علی کی تحریک کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ مولانا اسمٰعیل شہید کی اس خاص جماعت کو جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، زندہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اسی لیے مولانا نذیر حسین اور نواب صدیق حسن جیسے عالم بھی ان کا ساتھ دیتے ہیں۔

مولانا نذیر حسین، مولانا ولایت علی کے مدرسہ صادق پور (پٹنہ) کے ابتدائی طالب علم ہیں۔ بہار سے جب دہلی پہنچے تو مولانا محمد اسحاق اور ان کے اصحاب کی صحبت میں بیٹھے اور علمی تکمیل کی۔ غزوہ دہلی (۱۸۵۷ء) تک مولانا محمد اسحاق کے مسلک کے پابند رہے۔ اس کے بعد اگرچہ وہ صورت نجدی تحریک اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی طرف میلان ظاہر کرتے ہیں مگر فقہ و فتاویٰ عالمگیری کا شغل، ہدایہ کی تدریس اور وحدت الوجود کا فلسفہ ان کی پرانی ذہنیت کا عنوان آخر تک قائم رہا۔ اگر عوارض سے قطع نظر کر لی جائے تو وہ مولانا اسمٰعیل شہید کی اس مذکورہ جماعت کے احیاء کے سوا اور کوئی مقصد نہیں رکھتے تھے۔ بہرحال اسے انگریزی حکومت کے اثرات کا نتیجہ سمجھنا چاہیے کہ مولانا احمد علی بہاری کلکتہ میں اور مولانا نذیر حسین دہلی کے مرکز میں رہتے تاکہ ہر ایک اپنے اپنے مرکز میں کام کر سکے۔

مولانا ولایت علی کی جماعت کے دوسرے ممتاز عالم نواب صدیق حسن خاں ہیں۔ آپ کے والد ابو احمد حسن بن علی بن لطف اللہ حسینی تھے۔ آپ ۱۲۲۳ھ میں دہلی آئے اور شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین سے پڑھا۔ موصوف سید احمد شہید کے ساتھ رہے اور ان کی معیت میں جہاد کیا۔ آپ کا سال وفات ۱۲۵۳ھ ہے۔ خود نواب صاحب نے مولانا صدرالدین دہلوی سے تحصیل کتابیں پڑھیں اور مولانا محمد یعقوب دہلوی سے سند حدیث حاصل کی۔ اپنی کتاب "الحطہ" کی تصنیف تک موصوف مذہب ولی اللہ کے معارف کی ترجمانی کرتے رہے۔ لیکن اس کے بعد ان کی بیرونی معاشرت نے ان کو امام شوکانی کے اتباع پر مجبور کیا۔

آخر میں ہم صادق پوری پارٹی کے مرکزی فکر کے متعلق مولانا شمس الحق عظیم آبادی کے تلمیذ

خاص تلمیذ نذیر حسین کی کتاب "عون المعبود" سے چند جملے نقل کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

"اکثر عوام اور چند خواص[۲] کو غازی شہید امام السید احمد بریلوی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ خیال ہے کہ وہ مہدی تھے۔ نیز انہوں نے میدان غزا میں شہادت نہیں پائی بلکہ وہ لوگوں کی نظروں سے غائب ہو گئے۔ وہ اب تک زندہ ہیں اور اس عالم میں موجود ہیں۔ بعض تو اس معاملے میں اس حد تک بڑھ گئے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے انہیں مکہ معظمہ میں طواف کرتے دیکھا۔ لیکن پھر وہ یکبارگی غائب ہو گئے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ سید صاحب ضرور واپس آئیں گے۔ درحقیقت یہ بات غلط اور باطل ہے۔ صحیح حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب معرکہ غزا میں شہید ہو گئے اور وہ لوگوں کی نظروں سے غائب نہیں ہوئے۔ اس سلسلے میں جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں سب کی سب جھوٹی اور گھڑی ہوئی ہیں اور ان میں سے جو صحیح ہیں ان کو اچھے محمل پر محمول کرنا چاہیے۔ بدقسمتی سے سید شہید کی زندگی اور ان کے نظروں سے غائب ہونے کے عقیدے نے ایک لازمی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے اسے اپنے عقیدے کا جزو بنا لیا ہے۔ بہرحال جو اس کو نہ مانے یہ لوگ اس سے عداوت کرنے لگتے ہیں۔ ان لوگوں کی بے راہ روی کی اللہ ہی کی بارگاہ میں شکایت ہو سکتی ہے۔ اور ہم اس غیر معقول اور بے بنیاد عقیدے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔"[۱]

یہ اجمالی خاکہ ہے حزب ولی اللہ کے اس گروہ کا جو شاہ محمد اسحاق کے مسلک سے ہٹ

---

۱۔ اصل عبارت عربی میں تھی۔ یہاں اس کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے

۲۔ چند ایک خواص سے مراد مولانا ولایت علی ہیں۔ موصوف نے بڑی شدومد سے اس دعوت کو پھیلایا تھا اور اس میں ایک بڑی جماعت ان کے پیچھے لگ گئی۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ جماعت ہم سے علیحدہ ہو گئی۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے شاہ عبدالرحیم۔ شاہ ولی اللہ۔ شاہ عبدالعزیز۔ شاہ اسمٰعیل اور شاہ اسحٰق کے حنفی طریقے کو چھوڑنے کی ضرورت محسوس کی اور ۱۸۵۷ء کے معرکہ دہلی سے بے تعلق رہے۔ مؤرخین جماعت صادق پوری کا نام دیتے ہیں۔

رہا اور جسے ہم حزب صادق پوری کا نام دیتے ہیں۔ اب شاہ محمد اسحٰق کی دہلوی جماعت کا حال سنیے۔

مولانا محمد اسحاق کی امامت تحریک ولی اللہی پر ابھی پورے بیس برس نہ گزرے تھے کہ دہلی کے آخری بادشاہ کی انگریزی کمپنی سے لڑائی ہو گئی۔ گو سلطانِ دہلی کی حیثیت بظاہر ایک وظیفہ خوار رئیس کی تھی لیکن عام لوگوں کی نظروں میں وہ اب تک سارے ہندوستان کا موروثی سلطان تھا۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی اسی کے نام سے عوام پر حکومت کرتی تھی۔ چنانچہ ڈھنڈورا میں منادی والا کہا کرتا تھا: "خلق خدا کی ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا"۔ اس لئے عوام الناس کی رائے اسے ملک کا حقیقی مالک ماننے پر آمادہ نہیں کرتی تھی۔

سقوطِ دہلی کا واقعہ جو ۱۸۵۷ء میں پیش آیا، اسلامی دنیا کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ہماری رائے میں ہندوستانی وہی ہے جو اس ہندوستانی سلطنت کے زوال کو اپنی قومی مصیبت سمجھتا ہو۔ اس صدمۂ کبریٰ میں مولانا محمد اسحاق کی یہ جماعت پھر دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ مولانا موصوف نے جس گروہ کو اپنی نئی تنظیم میں مرکزی اختیارات دیئے تھے، اس گروہ نے ۱۸۵۷ء میں سلطانِ دہلی کی طرفداری کی اور شکست کے بعد مولانا محمد اسحاق کی طرح حجاز پہنچ گیا۔ چنانچہ امیر امداد اللہ، مولانا عبدالغنی، مولانا محمد یعقوب دہلوی کے ساتھ حجاز میں بیٹھ کر ولی اللہی تحریک کی ہندوستانی تنظیمات کی رہنمائی کرتے رہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا محمد اسحاق کے متبعین کی پہلی صف میں علماء اور صوفیہ کا کثیر حصہ سلطانِ دہلی کی لڑائی میں غیر جانبدار رہا۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ اگر ایک طرف مولانا محمد اسحاق کی تنظیم کے مقابلے میں جماعت صادق پوری زیادہ قوی ہو چکی تھی تو دوسری طرف خود شاہ محمد اسحاق کے اپنے گروہ میں ایک مخالف جماعت دہلی میں پیدا ہو گئی۔ مولانا نذیر حسین دہلوی اور مولانا شیخ محمد تھانوی[1] اس دوسری جماعت کے مشہور بزرگ

---

[1] شیخ محمد تھانوی خود بڑے بزرگ ہیں۔ حق کے مسلک پر ہیں۔ حضرت حاجی صاحب کا ... شیخ تھانوی کی جماعت کی سیاست کو غلط مانتے ہیں۔

میں سے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ امام عبدالعزیز کی حزب میں انشقاق کا بیج بالاکوٹ کی ہزیمت
کے بعد بویا گیا تھا۔ اس کے تلخ ثمرات کا تسلسل کسی طبقہ میں نہیں ٹوٹتا۔ جس طرح مولانا محمد اسحاق
کی جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی، اسی طرح امیر امداد اللہ کی جماعت میں اور پھر ان کے بعد
میں مولانا شیخ الہند کی جماعت میں مخالف پارٹی کے افراد دو گروہ بنے چلے آتے ہیں۔ امام عبدالعزیز کی
حزب سے اس قسم کے مخالف عناصر کو قطعی طور پر پاک صاف کرنے کے لیے جب تک دانشمند نوجوان کمر
ہمت نہیں باندھیں گے، یہ تحریک کبھی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔

فلسفہ کوتاہ، ولی اللہی تحریک کے دوسرے دور کی ابتداء میں مولانا محمد اسحاق کی مرکزی جمعیت حجاز
میں بیٹھ کر ہندوستان میں اس تحریک کے کاموں کی رہنمائی کرتی رہی۔ مولانا محمد اسحاق اور ان کے بعد امیر
امداد اللہ کو مکہ معظمہ کے قیام کے دوران میں اپنی تحریک کو جاری رکھنے میں جس قدر مشکلات پیش
آئیں، ان پر غالب آنا ان کے عزم اور علم کی روشن دلیل ہے۔ اور اسے امام عبدالعزیز کی تربیت سلسلہ
کی برکات میں شمار کرتے ہیں۔ اگر یہ حضرات امام عبدالعزیز کے تربیت یافتہ نہ ہوتے تو کبھی اپنا کام
جاری نہ رکھ سکتے۔ نیز ہم خود مکہ معظمہ؎ میں اس قسم کی زندگی کا تجربہ نہ کر چکے ہوتے۔ پھر حضرت مولانا

---

؎ ہم یہ حکم اس لیے لگاتے ہیں کہ ہم نے یورپ کی سیاسیات کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے ہاں پارٹی
کے نظام کو مخالف عناصر سے پاک رکھنا سب سے اول درجہ کا فرض ہے۔ وہ اس بارے میں کشت و
خون سے ذرہ برابر نہیں گھبراتے۔ اسی میں ان کی فلاح اور کامیابی کا راز مضمر ہے۔

؎ مکہ معظمہ میں کوئی خفیہ تحریک نہیں چلائی جا سکتی تھی اور نہ اب چلائی جا سکتی ہے، ہر کام کرنے والے
کے سر پر اس قدر غیر منظم عوام کا ہجوم مسلط رہتا ہے کہ اسے سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ مگر پھر
بھی جو کام کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنے لیے وقت نکال لیتے ہیں۔ میں حیران رہ گیا، جب مجھے معلوم ہوا کہ
مولانا اشرف علی صاحب جو مولانا شیخ محمد تھانوی کے سلسلے کے متبع ہیں، وہ امیر امداد اللہ کے مخصوص
اصحاب میں رہ چکے ہیں۔ اس کے بعد اسی طرح مولانا شیخ الہند کے قریبی دوست حجاز کے سفر میں

(باقی اگلے صفحہ پر)

شیخ الہند کے قیام مکہ معظمہ کے واقعات ہمارے سامنے نہ ہوتے تو ہم ان اکابر کی محنت کی قدر نہ کر سکتے۔

## دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

۱۸۵۷ء میں جب دہلی کی سلطنت کی آخری نشانی بھی مٹ گئی تو اس کے دو سال بعد شاہ محمد اسحاق کی مرکزی جمعیت نے جو اب حجاز میں مقیم تھی اور امیر امداد اللہ کی رہنمائی میں ہندوستان کام کر رہی تھی، فیصلہ کیا کہ اطرافِ دہلی میں امام عبدالعزیز کے مدرسے کے نمونہ پر ایک مدرسہ بنایا جائے۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سات سال تک مسلسل کوشش کرتے رہے، تب کہیں جا کر ۱۲۸۳ھ یعنی ۱۸۶۶ء میں سقوطِ دہلی کے نو سال بعد مدرسہ دیوبند کی تاسیس ہو سکی۔ اس کے بعد ان کی دوڑ دھوپ سے اسی طرز پر ایک مدرسہ سہارنپور میں اور ایک مراد آباد میں بنا جو

---

(بقیہ حاشیہ)

ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے تاکہ وہ کوئی خفیہ کام نہ کر سکیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ اس قسم کے کام کرتے رہے اور انہوں نے اس کے لیے اوقاتِ فرصت بھی نکال لیے۔ اس سے مجھے یہ قیاس کرنے میں آسانی ہوئی کہ اسی طرح امیر امداد اللہ بھی اپنے لیے وقت نکال لیتے ہوں گے۔ میں خود بھی اسی طرح کی مصیبت میں مبتلا رہا ہوں۔ اگرچہ میرا ہندوستان سے کوئی تعلق باقی نہ رہا تھا، مگر یورپ میں میرے کافی دوست موجود تھے، اور کابل کے لوگ بھی مجھ سے ملتے رہتے تھے۔ چنانچہ اس بنا پر مجھے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ لہٰذا اپنی ان تکالیف اور مولانا شیخ الہند کی مجبوریوں کو سامنے رکھ کر حاجی امداد اللہ صاحب کے کام کی جس قدر اہمیت میں سمجھتا ہوں، دوسرا شخص اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔

۱۔ ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کی بنا پڑی۔ اس کے فوراً بعد ملک کے دوسرے حصوں میں بھی اس کی شاخیں قائم کی جانے لگیں۔ چنانچہ مدرسہ دیوبند کے چھ ماہ بعد سہارنپور میں ایک شاخ کھلی۔ آخر میں تو ان شاخوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے چالیس تک پہنچ گئی تھی۔ مدرسہ دیوبند میں ان (باقی اگلے صفحہ پر)

مطالعہ کے لیے مقدم سمجھا رہا ہے۔

مدرسہ دیوبند کے مرکزی فکر اور اس کی سیاسی مصلحت کے اصول حاجی امداد اللہ اور ان کے رفقاء مولانا قاسم، مولانا رشید احمد اور مولانا محمد یعقوب دیوبندی کی جماعت نے متعین کیے تھے۔ اس لیے دیوبندی پارٹی کی مرکزی جماعت میں وہ شخص شامل نہیں ہو سکتا جو یہ اصول کاملاً تسلیم نہ کرتا ہو۔[1] مدرسۂ دیوبند کا سیاسی اصول یہ ہے کہ حزب ولی اللہ نے اپنے پہلے دور میں جس قدر علوم و معارف کی اشاعت ضروری سمجھی، حنفی فقہ کی پابندی سے ان علوم و معارف کو تدریس و تصنیف کے ذریعہ زندہ رکھا جائے۔ نیز اس مدرسہ کی باقاعدہ تعلیم سے جس قدر علماء تیار ہوں، وہ مساجد اور مدارس میں کام کرنے کے لیے پوری استعداد رکھتے ہوں۔ اس تعلیم کے بعد جس قدر علماء امام ولی اللہ کے جادۂ قویمہ اور حکمت کی حفاظت کرنا چاہیں، یا اپنے اندر حکومت کے مناصب عالیہ کی اہلیت پیدا کریں تو ان کے لیے کوئی خاص نصاب معین نہیں ہے۔ وہ درسی کتابوں سے فارغ ہو کر اساتذہ کی صحبت میں رہیں۔ مثلاً یہ علماء مولانا محمد قاسم کی صحبت میں امام ولی اللہ کی حکمت سے آشنا ہو سکتے تھے۔ مولانا محمد یعقوب دیوبندی کی رفاقت میں سیاسی اصول سمجھ سکتے تھے اور حاجی امداد اللہ کی بیعت سے پارٹی میں منسلک ہو سکتے تھے۔

علاوہ ازیں مدرسۂ دیوبند کے لیے ضروری ہے کہ حکومت کابل میں اپنا وقار پیدا کرے۔ اس کے ماورائے دریائے سندھ سے جس قدر طلبہ دیوبندی نظام کے ماتحت تعلیم پائیں، انہیں ہدایت کر دی جائے کہ وہ اپنی قوم کے نظام اور اپنی حکومت کے آئین کو برہم نہ کریں۔[2] جس طرح ہندوستان میں دیوبندی جماعت مسلمانوں کی دوسری جماعتوں کے ساتھ بالعموم مناظرہ و منازعت میں مبتلا ہو گئی ہے، کوشش کی جائے کہ یہ جھگڑے دریائے سندھ سے اُدھر نہ پھیلنے پائیں۔

---

[1] مولانا اشرف علی صاحب کے اتباع کا مرکز پر قبضہ کرنا طے شدہ اصول کے خلاف ہے۔

[2] یعنی وہاں جا کر اہلِ بدعت اور اہلِ حدیث کے رد کے جھگڑے پیدا نہ کریں۔

مدرسہ دیوبند کے لیے ضروری ہے کہ مکۂ معظمہ کے مرکز کے توسط سے سلطنت عثمانیہ کے ساتھ اپنا رابطہ زیادہ مستحکم کرتا رہے۔ نیز اضطراری حالات کو چھوڑ کر مدرسہ دیوبند کو چاہیے کہ حکومت انگریزی کے مصالح سے غیر جانب داری اختیار کرے۔

مدرسہ دیوبند کی تاریخ کا پہلا دور مولانا رشید احمد گنگوہی کی وفات پر ۱۳۲۳ھ میں ختم ہوتا ہے۔ اس چالیس سالہ دور کا سب سے بڑا کارنامہ علمی تحریک کی توسیع اور مرکزی فکر کی حفاظت ہے۔ اس عہد میں مدرسہ دیوبند کی علمی تحریک اطراف ہند سے نکل کر افغانستان و ترکستان اور حجاز اور قازان تک پہنچ گئی۔ اس اثنا میں دیوبند کے مرکزی فکر پر جس قدر بھی حملے ہوتے، خواہ وہ نصاریٰ اور ہنود کی طرف سے ہوں یا شیعہ و مبتدعین کی طرف سے یا نیچری علمی ذوق رکھنے والے ہندوستانیوں کی طرف سے یا یورپین ذہنیت رکھنے والے نوجوانوں کی طرف سے۔ ان میں سے اکثر اعتراضات کے جوابات محققانہ اور مجادلانہ تیار ہو گئے۔

یہ مدرسہ دیوبند کے پہلے دور کا کارنامہ ہے۔ مدرسہ دیوبند کا دوسرا دور ۱۳۲۳ھ میں حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی شیخ الہند کی صدارت سے شروع ہوا اور ۱۳۳۹ھ میں ان کی وفات پر ختم ہوا۔ اگر امام عبدالعزیز کی وفات پر ۱۲۳۹ھ میں حزب ولی اللہ کا پہلا دور ختم کر دیا جائے۔ اور امام ولی اللہ کے کام کی ابتدا ۱۱۴۳ھ سے پانچ سال پہلے جبکہ انہوں نے ترجمۂ قرآن لکھنا شروع کیا تھا، مان لیا جائے تو حزب ولی اللہ کا پہلا دور بھی سو سال کا بن جاتا ہے۔ اور دوسرا دور بھی پورے سو سال کا قرار پاتا ہے۔

مدرسہ دیوبند کے دوسرے دور میں سب سے پہلے مولانا شیخ الہند نے مدرسہ کے پرانے فارغ شدہ عالموں کو جمعیت الانصار میں جمع کرنا شروع کیا۔ اس طرح دیوبندی نظام کی تعلیم یافتہ جماعتوں کی ساری اجتماعی طاقت منظم ہو گئی اور اس نظام میں جس طرح ہندوستان کے علماء داخل ہوتے۔ اسی طرح افغانی اور ترکستانی علماء بھی شامل ہو گئے۔ نیز وہ تحریکیں جو اب تک غیر منظم صورت میں تھوڑے سے افراد پر مشتمل تھا، اس کے قواعد و ضوابط منضبط ہو گئے اور مولانا شیخ الہند

نے امام ولی اللہ اور مولانا محمد قاسم کی کتابوں کو اس درجہ کی تعلیم کا لازمی عنصر قرار دیا۔ علاوہ ازیں مدرسہ دیوبند کو دارالعلوم کے درجہ تک پہنچایا گیا اور دارالحدیث کو اس کی مرکزی درسگاہ (کالج) قرار دیا گیا۔

مولانا شیخ الہند نے ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں ترکی کے شامل ہونے کے بعد جمعیت الانصار کے توسط سے اپنی پارٹی کی پوری طاقت کو دولت عثمانیہ کی تائید میں جو اس وقت خلافت عثمانیہ کی حامل تھی استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ مولانا شیخ الہند کی تحریک باوجودیکہ ایک مذہبی اساس پر بنی تھی دنیا کی انقلابی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ آخر انقلاب فرانس بھی ایک مذہبی عالم کی تحریک سے شروع ہوا تھا چنانچہ اس کی وجہ سے فرانس کی انقلابی طاقت کی توہین نہیں ہو سکتی۔ ہم اس وقت مولانا شیخ الہند کی اس تحریک کی تفاصیل ان صفحات میں بیان کرنا نہیں چاہتے۔ ہمیں یقین ہے کہ آنے والے دور کے مورخ اسے نہایت صفائی سے لکھ سکیں گے۔ ہندوستان، انگلستان، افغانستان اور ترکستان کی تاریخ تو اس واقعہ کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کے علاوہ یورپ کی انقلابی طاقتیں بھی اس کا احترام کرنے پر مجبور ہیں۔

---

۱؎ مولانا شیخ الہند نے ہمیں کابل بھیجا۔ وہاں جا کر ہم نے شیخ الہند کی پچاس سالہ محنت کا نتیجہ دیکھا۔ امیر امان اللہ خاں کا بیرونی کارنامہ شیخ الہند کی جماعت کے کام کی ایک برکت ہے۔ امیر امان اللہ شکست کھا جاتے ہیں مگر ہم اس سے نہیں گھبراتے۔ ان کی شکست کا نتیجہ ہمارا وہ مستقل پروگرام ہے جسے ہم انڈین نیشنل کانگریس میں رہتے ہوئے جاری کرنا چاہتے ہیں۔ (اس پروگرام کی تفصیل آگے آتی ہے)

۲؎ پہلے ہمارا خیال تھا کہ مولانا شیخ الہند کے ان واقعات کے متعلق اجمالی اشارے حاشیے میں لکھوا دیں گے جس سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی لیکن بعد میں ہماری رائے بدل گئی۔ کیونکہ اس اہم معاملہ میں اشاروں سے کام نہیں نکلے گا۔ اب ہمارا فیصلہ ہے کہ اس موضوع پر انگریزی میں مستقل رسالہ لکھوائیں گے جس میں پہلے تو شیخ الہند کا اس تحریک میں اصلی مقام کیا تھا اسے معین

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مولانا محمد اسحاق نے، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ۱۲۳۹ھ کے بعد حزب ولی اللہؒ کے دوسرے دَور کو دولتِ عثمانیہ کے اتصال سے شروع کیا تھا۔ بعد میں مولانا شیخ الہند کے مشائخ نے اسے تکمیل کو پہنچایا۔ مگر ۱۹۱۸ء میں گزشتہ جنگِ عظیم کے موقع پر جب دولتِ عثمانیہ ساقط ہو گئی تو حزب ولی اللہ کا دوسرا دَور بھی ختم ہو گیا۔ مولانا شیخ الہند نے دولتِ عثمانیہ کی تائید کے لیے جو تحریک شروع کی تھی، اس کا مرکز دہلی تھا۔ اس سے ضمنی طور پر ہندوستانی انقلاب کی تائید میں ایک غیر متوقع صورت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ مولانا شیخ الہند نے اب ہندوستانی انقلاب ہی کو اس تحریک کا اپنا مستقل موضوع بنا لیا۔ اس سے ہم حزب ولی اللہؒ کا تیسرا دَور شروع کرتے ہیں۔

مختصراً حزب ولی اللہؒ کا دوسرا دَور مولانا محمد اسحاق دہلوی نے ۱۲۳۹ھ میں شروع کیا تھا اور ۱۳۳۹ھ یعنی ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہ کی وفات پر یہ دور ختم ہو گیا۔ یہاں سے ہم تیسرے دور کی ابتدا مانتے ہیں۔ چنانچہ حزب ولی اللہؒ کے تیسرے دور کے

---

(الف حاشیہ) کریں گے۔ ہمارے نزدیک مولانا محمد قاسم حکیم الہند امام ولی اللہ کی حکمت اور انقلاب کے مجدد تھے اور مولانا شیخ الہند اپنے استاد مولانا محمد قاسم کے علم و عمل کے آرگنائزر۔ اس کے بعد سر جیمس کاکس اور مسٹر ٹینگلو وغیرہ برطانوی مدبرین کے بیانات کی روشنی میں اس تحریک کی سرگرمیوں پر بحث ہو گی۔

مولانا شیخ الہند جب مالٹا میں اسیر ہوئے تو وہاں دول یورپ کے مختلف نمائندوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ حیران تھے کہ ایک ہندوستانی جو برطانوی سبجکٹ ہے، گورنمنٹ سے فراق کا اعلان کر چکا ہے۔ وہ کس طرح سزائے موت سے بچ گیا اور پھر اسے جنگی قیدی کا اعزاز کیوں دیا گیا۔ مولانا شیخ الہند کے خدام جو یورپ میں کام کر رہے تھے، ان حکومتوں کے لوگ جب ان سے ملتے تو انہیں اس تحریک کی تحقیق کا موقع ملا۔ ہم سے بھی جب کبھی یہ لوگ کابل یا یورپ میں ملے تو انہیں مسائل پر بحث کرتے رہے۔ اس رسالہ میں ان مباحث کا خلاصہ بھی دیا جائے گا۔ مضمون کی نوعیت کا تقاضا ہے کہ یہ کتاب انگریزی میں شائع ہو۔

[1] اس دَور کی ابتدا ترکی انقلاب سے شروع ہوئی جب ترکی خلافت ختم ہو گئی اور یہ پروگرام بھی بیکار ہو گیا۔

اساسی اصول ہمارے نزدیک حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مولانا شیخ الہند نے امام ولی اللہ کی حکمت پڑھنا ضروری قرار دیا۔ اس سے ہم ایک خاص نتیجہ نکالتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ امام ولی اللہ کی فلاسفی کو ہم اپنی مستقل پارٹی کا اساسی اصول بناتے ہیں۔ امام ولی اللہ کی فلاسفی غیر مسلم ہندوستانی کو بھی اپنے ساتھ لے سکتی ہے۔ نیز یہ یورپین ازم کی لادینیت کو فنا کر سکتی ہے۔ پھر اس فلاسفی نے اقتصادیات کے متعلق جو اصول سمجھائے ہیں اس کی بنا پر یہ تمام دنیا پر تفوق حاصل کر سکتی ہے۔

(۲) مولانا شیخ الہند نے علی گڑھ کالج کے انقلابی عنصر کو اپنی تحریک میں شامل کر لیا تھا۔ ان کے پارٹی پروگرام چلانے والے ایک طرف مولانا کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد تھے تو ان کے ساتھ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا محمد علی مساوی درجہ پر شریک تھے۔ مولانا شیخ الہند کے اس اقدام سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہم یورپین ازم کو اپنی پارٹی کے مستقل پروگرام میں داخل کرتے ہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا انگریزی پڑھا طبقہ جسے ہم کالج پارٹی کا نام دیتے ہیں آگے چل کر نا محالہ ترکوں کے کمالی پروگرام کو قبول کرے گا۔ چونکہ ترکی میں کمالی پروگرام کے ساتھ لادینیت بھی آ گئی ہے اور لادینیت کے معاملے میں ہم سکوت نہیں کر سکتے، اس لیے اس کو رد کرنے کے لیے ہم امام ولی اللہ کی فلاسفی کو اپنے پروگرام کا ضروری اساس بناتے ہیں۔

(۳) مولانا شیخ الہند انڈین نیشنل کانگرس میں شریک ہو گئے تھے۔ اس سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ عدم تشدد کی پالیسی سے ڈومینین اسٹیٹس حاصل کیا جائے۔ ہماری پارٹی کے پروگرام کا یہ تیسرا اصول ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عدم تشدد کی پابندی کا لازمی نتیجہ صرف ڈومینین اسٹیٹس ہی ہو سکتا ہے۔

حزب ولی اللہ کے تیسرے دور کے لیے ہم جو پروگرام تجویز کرتے ہیں، ہمارے نزدیک اس کے یہی تین اصول ہیں۔ جس طرح پہلے دور کے خاتمہ پر اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد اسمٰعیل شہید اور ان کے رفقاء کے کارناموں سے ولی اللہی تحریک کو زندگی بخشی، ہم امید کرتے ہیں کہ دوسرے

دور میں مولانا شیخ الہند اور ان کے مشائخ نے جو خدمات سرانجام دی ہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے
ان کو قبول فرمائے گا۔ ان کے عزائم میں جس قدر برکت نازل کرے گا کہ امام ولی اللہ کی تحریک اپنے اس
تیسرے دور میں ہندوستان کی اصلاح کر کے اُسے اس منزل پر پہنچا دے گی کہ وہ دنیا کی رہنمائی کا ذریعہ
بن سکے۔ اللہ ہی ہے جو اس میں کارسازی فرمائے۔

حزب ولی اللہ کے تیسرے دور کے اس پروگرام کی وضاحت کے سلسلے میں چند باتیں اور لکھنا
ضروری ہیں۔ ۲۱ ذیقعدہ ۱۱۴۳ھ جمعہ کی شب (۱۷۳۱ء) کو امام ولی اللہ نے ایک الہامی خواب
دیکھا تھا جس میں آپ کو یقین دلایا گیا تھا کہ گردش کے مقاصد کی اصلاح کے لیے ان کو ایک
مستقل ذمہ دار حیثیت دی جائے گی، نیز نظم سلطنت آمادہ بیکار ہو چکا ہے کہ اسے توڑ دیا
جائے گا۔ اور اس کی جگہ نیا نظام قائم کرنے کا وہ ذریعہ بنیں گے۔ دوسرے لفظوں میں ہندوستانی مسلمانوں
کے تمام دینی علوم اور سیاسی و اجتماعی تحریکات میں امام ولی اللہ مستقل امام ہوں گے۔ تفہیمات (۲/۱۲۲)
میں ایک اشارہ ہے کہ آپ کو اس الہام کی تکمیل کے لیے انبیاء کی طرح صبر کرنا چاہیے۔ امام ولی اللہ
نے اپنے فکر سے سوسائٹی کے اعلیٰ طبقہ کو متعارف کیا اور تعلیم وارثت کے لیے ایک جماعت تیار کر
لی۔ اس کے بعد شاہ عبدالعزیز نے نظام حکومت چلانے کے لیے آدمی بھی تیار کر دیئے۔ جنہوں نے ۱۸۲۶ء
میں اپنی مؤقت حکومت بنائی۔ لیکن بالاکوٹ کے حادثہ میں اس حکومت کو شکست ہوئی اور امیر شہید
اور اُن کے ساتھی شہادت پا گئے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ وہ شکست کیوں کھا گئے؟ ہم اپنی پرانی ذہنیت
میں اس نتیجے سے بہت متاثر رہے اور کبھی بدگمان اور کبھی کسی کو ذمہ دار ٹھہرا کر اس دور میں ہم
اپنا جی ٹھنڈا کر لیتے تھے۔ مگر اثنائے سیاحت میں جب ہمیں یورپ کی انقلابی تحریکوں کے مطالعہ کا
موقع ملا تو ہم نے دیکھا کہ ایک اعلیٰ انقلاب کی منزل تک پہنچنے میں متعدد بار شکست کھانا چنداں
بعید نہیں ہے۔ کیا خود اسلام کی ابتدائی تاریخ میں باہمی خانہ جنگیاں نہیں ہوئیں۔ یہ چیز اصل میں
انقلابی تحریک کے لوازم میں سے ہے۔ اس کے بعد ہم مطمئن ہو گئے کہ اگر شاہ صاحب کی تحریک

ایک بار شکست کھا گئی تو یہ حقیقت میں تحریک کی مکمل شکست نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم نے اپنے دیوبندی اساتذہ کے کام کو شاہ صاحب کی تحریک کا دوسرا دور قرار دیا۔ اس دوسرے دور کو ہم مولانا شیخ الہند کی وفات پر ختم کرتے ہیں۔ اس دور میں بھی اس تحریک کو شکست ہوئی۔ مگر وہ اپنے پیچھے تیسرے دور کے لیے مبادی تیار کر گئی ہے اور میں اسی امید پر زندہ ہوں۔ مجھے اس تحریک کی آخری کامیابی میں کسی قسم کا تذبذب و تردد دامن گیر نہیں ہے۔

مثال کے طور پر اشتراکی تحریک کو دیکھیے۔ سوشلسٹ انقلابی تحریک سب سے پہلے فرانسیسی انقلاب کے موقع پر شروع ہوئی اور اسے شکست ہوئی۔ پھر دوسری بار منظم ہوئی اور شکست کھا گئی۔ بعد ازاں روس میں لینن نے اس کو تیسری بار منظم کیا اور اس کا نام اسی مناسبت سے تھرڈ انٹرنیشنل تجویز ہوا۔ کارل مارکس کے اصلی نظام اور لینن کے موجودہ نظام میں کافی فرق ہے۔ مگر وہی تحریک اپنے تیسرے دور میں کامیاب ہو کر رہی اور زمین کے ایک بڑے قطعے پر اپنی حکومت قائم کر سکی۔

ہماری تحریک کے اس تیسرے دور میں میرے نزدیک حزب ولی اللہ کی سیاست میں مصطفےٰ کمال کا ترکی انقلاب ایک تمدنی ہوگا۔ اور شاہ ولی اللہ کا عقلی اور اقتصادی فلسفہ اس پر حکومت کرے گا۔ نیز عدم تشدد کی پابندی سے انڈین نیشنل کانگریس کے اندر رہ کر حکومت بنانے کے لائق آدمی تیار کرنا ضروری ہوں گے۔ میں ان اصولوں پر ایک نئی پارٹی مولانا شیخ الہند کی یادگار میں قائم کرنا چاہتا ہوں۔ یہ میرے اصول حضرت شیخ الہند کے تلقین کردہ ہیں۔

(۱) شاہ ولی اللہ کے فلسفے کو وہ دیوبند کے درجۂ تکمیل میں داخل کر چکے ہیں۔

(۲) ان کے زمانے میں ترکی کی تقلید علی گڑھ کالج میں موجود تھی اور مولانا شیخ الہند کالج کی تحریک کو اپنے اندر جذب کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ چنانچہ ان کے آگے کام کرنے والوں میں اگر ایک طرف مولانا کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد تھے، تو دوسری طرف ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی بھی تھے۔ بے شک علی گڑھ کالج اگر ایک قدم آگے بڑھے گا تو مصطفےٰ کمال کی نقل کرے گا۔ ہم اس ترقی یافتہ

علی گڑھ کو اپنے اندر لینا چاہتے ہیں۔ دیوبندی جماعت کا جو آدمی یہ حوصلہ نہیں رکھتا، اس کو سیاسیات
سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔ اور اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اپنے کسی کام کو شیخ الہند کی طرف
منسوب کرے۔

وَتِلْكَ شَكْوَاكَ لِلشَّيْخِ تِذْمَا      وَقَدْ نُحِتَ لِلشَّيْخِ الْهِنْدِ حَالًا

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی سے شاہ صاحب نے اساسی اصول مقرر کیے ہیں
اس سلسلے میں ہمیں بتایا ہے کہ کسی نظام کی جگہ دوسرا انتظام لانے کے لیے ایک عرصہ تک تیاری کرنا
پڑتی ہے۔ اور اس کے لیے کارکنوں کی تربیت بھی ضروری ہوتی ہے۔ چنانچہ اس مدت میں عدم تشدد
کی پابندی لازمی ہے۔ ان اصولوں کی اتباع اور ان کے نہج پر تیاری کے لیے انڈین نیشنل کانگریس
میں ہمیں وسیع میدان ملتا ہے۔ اس کے مدنظر ہم کانگریس میں نئی پارٹی بنانا چاہتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ ہماری قوم پرانے اصول حکومت بھول چکی ہے۔ اب وہ یورپین طریقے کے
نظام حکومت کو دیکھ کر ہی کامیاب ہو سکے گی۔ افغانستان، ترکی، عربی ممالک یقیناً سب کے سب
یورپین طریقے پر اپنی حکومتوں کی تجدید کر رہے ہیں۔ ہم یہاں شاہ جہاں کی حکومت کا اعادہ نہیں
کر سکتے۔ بے شک روح وہی رہے گی۔ مگر حکومت کی صورت یقیناً یورپین ہوگی۔ ہمیں اس وقت
ڈومینین اسٹیٹس قبول کرنا چاہیے۔ اس سے ہمیں یورپ کی ایک بڑی حکومت کا تعاون حاصل ہوگا
ہم موجودہ حالات میں بہت سی مصلحتوں کو ملحوظ رکھ کر برٹش کامن ویلتھ میں رہنا منظور کرتے ہیں

مگر کانگریس کے عام طرفدار ان چیزوں کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے۔ یورپ میں جس طرح
انقلاب ہوا، اس قسم کے انقلابات کی وہ یہاں توقعات باندھے بیٹھے ہیں۔ لیکن ہمارا ملک یورپ
سے بہت سے بنیادی امور میں مختلف ہے۔ یورپ میں عمومی تعلیم، پریس کی ترقی اور فوجی خدمت
کے لزوم نے انقلاب کے لیے میدان صاف کر دیا تھا۔ ہمارے عوام علم سے بے بہرہ اور فوجی ڈسپلن
سے ہزاروں کوس دور ہیں۔ لہٰذا وہ یورپ کے طریقے پر انقلاب کو کبھی نہیں سنبھال سکتے۔

اس طرح کے انقلاب کا ابھی اسی زمانے میں دو بار تجربہ ہو چکا ہے۔ پہلا تجربہ روس میں ہوا۔

روس میں عمومی تعلیم زیادہ نہ تھی تاہم انقلاب کے داعیوں نے طے کر دیا کہ وہ اس کو کامیاب بنا کر دکھا دیں گے، مگر وہ اس میں سو فیصدی ناکام ہوئے۔ شکست کے بعد انہوں نے عوام کی تعلیم کو اساس قرار دے کر جبر اور ڈکٹیٹرشپ سے کام لیا۔ اس طرح ایک حلقہ ملک کو تیار کیا اور اس کے مناسب انقلابی نظام بھی تبدیل کر دیا۔ تب کہیں جا کر وہ حکومت چلا سکے۔ جو لوگ کارل مارکس کے پکے تبع ہیں وہ لینن کے کام کو کبھی تعریف کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ لینن نے بہت سی ایسی تبدیلیاں منظور کر لی تھیں جو اس کے ملک کے لیے ضروری تھیں۔ روس کے انقلاب کو ہندوستان میں بیٹھ کر پڑھنے والے ایسے امور سے کبھی واقف نہیں ہو سکتے۔

دوسری بار انقلاب ترکی میں ہوا۔ روسی عوام میں تو فی الجملہ ابتدائی تعلیم تھی۔ لیکن ترکی اس سے بالکل بے بہرہ تھا۔ مصطفےٰ کمال مجبور تھا کہ عربی زبان اور عربی رسم الخط کو قطعی طور پر ترک کر کے اپنے اہل ملک کو ان کی مادری زبان رومن حروف میں سکھائے۔ چنانچہ وہ اپنی ڈکٹیٹرشپ کے زور سے بہت جلد ایک پارٹی بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

لیکن ہمارا ملک، روس اور ترکی ہر دو سے پیچھے ہے۔ بے شک ہمارے ہاں ایک مختصر سا متوسط طبقہ پیدا ہو چکا ہے، جو یورپ کے تمام علوم کو جانتا ہے۔ وہی کانگرس کو چلا رہا ہے اور وہی انقلاب کی توقعات باندھے ہوئے ہے۔ مگر انقلاب عوام کی شرکت کے بغیر کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ اور یہ لوگ ہیں کہ ہندوستانی عوام کے نزدیک جانا بھی پسند نہیں کرتے۔

اس میں شک نہیں کہ گاندھی جی ان تمام چیزوں کو سمجھتے ہیں، مگر وہ گجرات سے باہر ہندوستان کے کسی گوشے میں اپنی طرز کی حکومت نہیں بنا سکتے۔ گاندھی جی ادنیٰ طبقہ کی خدمت اور تربیت کے واسطے متوسط طبقے کو (جو انکو لیڈر مانتا ہے) متوجہ کر سکتے ہیں۔ ہم اس کی پوری قدر کرتے ہیں، مگر یہ انقلاب کے مبادی میں معمولی درجہ کی چیز ہے۔ انسانیت کے مفاد عامہ کے لیے اپنی جان قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرنا انقلاب کی اصل اساس ہے۔ یہ چیز گاندھی جی کی اپنی شخصیت میں علیٰ وجہ الکمال موجود ہے۔ لیکن ان کے معتقدوں میں شاید فیصدی ایک بھی نہ ہو۔ اس لیے ہم گاندھی پارٹی کے معنوی

شور و شغب سے متاثر نہیں ہوتے۔

ہم اپنے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق انسانیت کی اصلاح کے لیے قربانی کا جذبہ بہ نہایت آسانی سے پیدا کر سکتے ہیں۔ قرآن عظیم کا یہ مقصد معین کرنے میں امام ولی اللہ ہماری نظر میں منفرد ہے۔ اس لئے ہم ان کے سوا کسی کی تفسیر کو قبول نہیں کر سکتے۔

ہم جس طرح اپنے نوجوانوں کو قرآن عظیم کی تعلیم کی بدولت اسی مقصد عالی کی طرف لے آتے ہیں، اسی طرح اگر ہندو تعلیم یافتہ نوجوان ہم پر اعتماد کرے تو ہم اس کو ولی اللہ فلاسفی پڑھا کر بھگوت گیتا کی تعلیم کے ذریعہ اسی مقصد پر لے آئیں گے۔ یہی طرز ہمارا بائبل ماننے والی اقوام کے ساتھ رہے گا۔ ہم ولی اللہ فلاسفی پر بائبل پڑھا کر ان کو بھی انسانیت عامہ کے مقصد پر جمع کر دیں گے۔

الغرض مولانا شیخ الہندؒ ہمیں تین چیزیں بتا گئے ہیں۔ اول یہ کہ آپ نے درجۂ تکمیل میں شاہ ولی اللہ کا فلسفہ اور مولانا محمد قاسمؒ کی حکمت داخل کرائی۔ دوم سیاسی تحریک میں دیوبندی جماعت کے ساتھ علی گڑھ پارٹی کو مساوی درجہ پر شامل کرنا منظور کر لیا۔ سوم یہ کہ انڈین نیشنل کانگریس کے اندر جا کر بیرونی ممالک اسلامیہ کی سیاسیات سے علیحدگی اختیار کر کے کام کرنے کی راہ سمجھی۔

ہمارے اس مقولہ کا "پہلے یورپین ہو" اصل مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے اندر جنگی طاقت اور حربی قوت پیدا کریں۔ شاہ ولی اللہ اپنی کتاب "تفہیمات"[1] صفحہ ۲۲ میں لکھتے ہیں کہ حکومت چلانے کی استعداد مسلمانانِ ہند سے افغانوں کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ اس سلسلہ میں شاہ عبدالعزیزؒ نے ایک خواب بھی دیکھا تھا جس میں امیر المومنین حضرت علیؓ نے انہیں پٹھانوں کی طرف توجہ کرنے کی تلقین فرمائی تھی۔ دراصل اس سے مراد فقط جنگی طاقت اور حربی قوت ہے۔ افغانوں میں چونکہ لڑنے مرنے کی مردانگی موجود ہے اس لیے ان کو ایک نظام منظم کر کے اسلامی حکومت کی فوج بنا سکتا تھا۔ مگر جس قوم سے لڑنے مرنے کی طاقت سلب کر لی گئی ہو وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ آج اس کی مثال ہندوستان سے ملتی ہے۔ وہ

---

[1] تفصیل ملاحظہ ہو ضمیمہ

بڑا حساب داں ہے۔ بڑا مالدار ہے مگر وہ حکومت نہیں سنبھال سکتا ہے۔ اور ایک معمولی سپاہی اس
کی جائداد پر قبضہ کرکے مالک بن سکتا ہے۔

اگر ہندوستانی قومیں انگریزی فوج میں ملازمت کرکے یورپین طریقہ پر سپاہی بنا سکیں گی تو
ان کے لیے ہندوستان کی آئندہ حکومت کو سنبھالنا ممکن ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ میں باوجود ہزارہا
اختلافات کے سر سکندر حیات خان وزیر اعظم پنجاب کی حیثیت تائید کرتا ہوں کہ وہ میری قوم کو فوج
میں بھیجنے کا حامی ہے۔ سو میں نوے افراد جنگ میں مر سکتے ہیں مگر دس جو واپس آئیں گے وہ ہمارا
اصلی سرمایہ ہوگا۔ اس لئے ہم تعلیم یافتہ طبقہ کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ یورپین طریقے پر فنون حرب سیکھیں
مستقبل میں جب ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹس مل جائے گا تو اس وقت وہ اپنے کاشتکاروں کو فوجی
تعلیم دے سکیں گے۔ اس کے لیے کاشتکاروں کو بھی یورپین بنانا پڑے گا۔ اگر قومی زندگی میں کاشتکاروں
کی اہمیت کا انکار کیا گیا قرآن کا وجود بھی بیکار ہو جائے گا۔ اسی لیے ہم اپنی قوم سے وہ لعنت
کے جراثیم جو مسجدوں اور خانقاہوں سے چمٹے ہیں اور قوم کو نامردی سکھانے کا نام انہوں نے اسلام
رکھا ہوا ہے، مذکورہ وقت آنے سے پہلے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔

ہم تمام لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی مادری زبانیں انگریزی حروف میں لکھنا پڑھنا
شروع کر دیں۔ اپنے خاندان کے کسی فرد کو وہ عورت ہو یا مرد ایسا نہ چھوڑیں کہ وہ اپنی زبان لاطینی
حروف میں نہ لکھ سکتا ہو۔ اس کے بعد اس کو ترکوں کی طرح زندگی بسر کرنا سکھانا چاہیے۔ ترکوں
میں بھی اسی طرح بے ایمان لوگ موجود ہیں جیسے ہمارے یہاں ہیں۔ مگر ترکی قوم کے ایمان میں
مجموعی طور پر جسے شبہ ہو سکتا ہے وہ احمق ہے۔ اب ترکوں نے اپنا قومی طریقہ یورپین سسٹم
بنا لیا ہے۔ ہم اس مسلم قوم کے ترقی یافتہ نمونے پر اپنی قوم کو تیار کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن بڑے
افسوس کی بات ہے کہ ان حقائق سے ہمارے بڑے بڑے عالم ناواقف ہیں۔ اس وقت ان کو واقف
کرانے کی اشد ضرورت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کو نہایت نرم زبان میں یہ باتیں سمجھا دی جائیں
گی مگر ہماری قوم میں ایک فطری خطرہ بھی موجود ہے۔ وہ مسلمانوں کی ہر تباہی کو قبول کر سکتا ہے۔

مگر اپنے پرانے طرز میں کسی تبدیلی کا روادار نہیں ہو سکتا۔ ہم انہیں منہ نہیں لگاتے تھے اور جب ترقی
ملے گا ہم انہیں ختم کر دیں گے۔ یہ کہہ کر میں صرف اپنی ذہنیت کی ترجمانی نہیں کر رہا۔ مجھے معلوم ہے
کہ ہندوستان میں انقلاب آئے گا۔ میں اصل میں اس انقلابی جماعت کی ترجمانی کر رہا ہوں۔ ہم نے
روس میں اور ترکی میں انقلابی جماعتوں کا فاتحانہ تجربہ کیا ہے۔ وہ سب کے سب ایک ہی مسلک پر چل
رہے ہیں۔ ان کی زبانیں مختلف ہیں، ان کے مذاہب مختلف ہیں مگر معاشرت کا فلسفہ سب میں مشترک
ہے۔

ہمارے ہاں کے سمجھدار طبقے کو ہماری طرح جب تک کہ ہم ہندوستان میں تھے، یہاں ایک
شبہ دامن گیر ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انگریزی کالجوں اور انگریزی دفاتر سے ہمارے نوجوان سوائے یورپین
فیشن کے اور کچھ نہیں سیکھتے۔ اس سمجھدار طبقے نے دیکھا ہے کہ یہ نوجوان جو ملازمت سے پیدا کرتا ہے
اور اپنی ضروریات اس قدر بڑھاتا ہے کہ باپ دادا کا اندوختہ اس فیشن پرستی کی نذر کر کے ختم کر دیتا
ہے۔ پھر نزاکت، بزدلی اور نامردی کا پورا پورا نمونہ بن جاتا ہے۔ اور وہ دن رات اس رٹ میں لگا رہتا
ہے کہ یورپین بنے بغیر انسان انسان نہیں کہلا سکتا۔ ہمیں خود اس گروہ سے اپنی زندگی میں کافی واسطہ
پڑتا رہا ہے۔ ہم اپنی پرانی ہندوستانی زندگی میں اس سے متنفر رہے اور اپنی قوم کو اس خبیث زندگی
سے بچانے کے لیے کوشش کرنا اپنا فرض جانتے تھے۔

اب ہماری ذہنیت یہ بن چکی ہے کہ ہم ان نازک اندام افراد کے بجائے اپنے کاشتکاروں کو
لیڈر بنانا چاہیں۔ ہمارا یورپین ازم کا عملی تجربہ غلط اور غیر مفید ثابت ہوا۔ ہم اپنی قوم کے کارکن
عنصر کو جو ہمارے ملکوں میں زیادہ تر کاشتکار ہے، اقتصادی مصیبتوں میں گرفتار دیکھتے ہیں۔ ان کو ان
مصائب سے نجات دلانا قوم کی ہستی کے لئے ضروری ہے اور اس کی نجات کا اور کوئی ذریعہ نہیں
سوائے اس کے کہ یہ عنصر اپنی اصلاح کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ مگر اس اصلاح کے لئے اسے تعلیم دینا
ضروری ہے۔ سرمایہ دار حکومت نے تعلیم قوم کے چند افراد کے لئے مخصوص کر رکھی ہے۔ اور یہ
ناممکن ہے کہ ہم اپنے کاشتکاروں کو کالج کے گریجویٹ بنا سکیں۔ مثلاً یورپ کے طریقے پر کاشتکار

کو تعلیم یافتہ بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن سب سے پہلے انہیں اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھنا چاہیئے اس کے لیے جہاں عربی رسم الخط ایک قومی مانع ہے۔ ایک ایسے انسان کو جو بیس گھنٹے کام میں مصروف رہتا ہے، یہ خط سکھانا جو ایک ایک حرف کی کئی شکلیں پیش کرتا ہے، سیکھنے اور سکھانے والے دونوں کے لیے بے حد دشوار ہے۔ اس کے برعکس روسی حروف جو علیحدہ علیحدہ لکھے جاتے ہیں ان کی ایک دفعہ حروف شناسی ہو جائے تو پھر ساری عمر کے لیے انسان فارغ ہو جاتا ہے۔ ہم ٹائپ رائٹر مشین کے ذریعہ اپنے بچوں کو چند گھنٹوں میں اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا سکھا سکتے ہیں۔ سپاہی بننے کے لیئے اتنی ہی تعلیم ضروری ہے۔ اس تعلیم پر وہ مصارف بھی عائد نہیں ہوتے جو کالج میں گریجوایٹ بننے پر آتے ہیں اور نہ انسان فیشن پرستی کا شکار ہو کر نزاکت اور بزدلی کا شکار بن سکتا ہے۔

جس وقت ہم اپنی مادری زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھ گئے تو ہر زبان کے لیے ایکم کری پریس تعلیم دینے کے لیے کافی ہے۔ اس سے ماہوار رسالے نکلیں گے۔ ہفتہ وار پرچے ہوں گے۔ روزنامے ہوں گے۔ اور ہر شخص اپنی زبان میں گھر بیٹھے پڑھ سکے گا۔ قوموں کو اس طرح تعلیم دینے کی صورت جس طرح اس عہد میں موجود ہے پہلے زمانے میں کسی کے خیال میں بھی نہیں تھی۔ اس لیئے اس سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

مذکورہ بالا بنیادی تعلیم حاصل کرنے کے بعد میرا اپنا ذاتی دوسرا پروگرام بھی ہے۔ میں کم از کم قرآن عظیم کی چالیس سورتوں کی تفسیر کر کے اس کو قوم کی مادری زبان میں پریس کے ذریعہ ان کے گھروں میں پہنچا دوں گا۔ اس کے بعد ان کو کوئی دجّال دین سے بھٹکا نہ سکے گا۔ سوائے ان لوگوں کے جو دجالیت پر مطبوع ہوتے ہیں۔ میری زندگی کا آخری مقصد یہی آخری چیز ہے۔ مگر یہ اس پہلی تعلیم پر موقوف ہے۔ اسی لیئے میں اس پر زور دیتا ہوں۔ اب اس سے بہتر کوئی اور پروگرام ہو تو میرے مخاطب اسے میرے سامنے لائیں۔ میں اس کو مان لوں گا۔

مسلم لیگ کے اراکین کی اسکیمیں جو ساری عمر انگریزی دفتروں میں کام کرتے رہے یا کسی عالم

# ضمیمہ جات

سلہ آصف جاہ اوّل

موجودہ نظام حیدرآباد کے جدِ امجد ہیں۔ وہ سلطان عالمگیر کے دربار کے پروردہ اور سربر آوردہ تھے۔ عالمگیر سلطنت ختم ہو گئی، مگر آصف جاہ کی اولاد اب تک حکمران ہے۔ آصف جاہ نے دہلی کی سلطنت کو تقویت دینے کے لیے اسکیم تیار کی تھی۔ وہ اپنی عقل اور دانش کو دربار محمد شاہ کی تقویت کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے لیکن وہ اس میں ناکام رہے۔ جس پر انہوں نے اپنی عقل کو خود اپنی شخصی ترقی اور ترفیع کے لیے لگا دیا۔ جس میں وہ کامیاب ہوئے۔ محمد شاہ ابتدا میں ان کا طرفدار تھا مگر بداندیش درباریوں نے بادشاہ کو آصف جاہ سے بدظن کر دیا۔ بعد ازاں ان کو خود اپنے لیے جو کچھ کرنا تھا کیا۔ گو پہلے وہ اپنی تمام قوتیں دربار کے لیے صرف کرنا چاہتے تھے۔

مولانا سید سلیمان ندوی مقدمہ سیرت سید احمد شہید صفحہ ۱۱ میں لکھتے ہیں شاہ عبدالرحیم کے مکاتیب کا ایک نسخہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے کتب خانہ میں میری نظر سے گزرا اس

میں آپ کا ایک خط نظام الملک آصف جاہ اوّل کے نام ہے جس میں انھوں نے نواب مرحوم کو مرہٹوں سے جہاد کرنے کی ترغیب دی ہے۔ آصف جاہ کے حالات اور اس کے کارناموں کے لیے سیر المتاخرین اور تاریخ ہندوستان ذکاء اللہ جلد نہم دیکھئے۔ آپ کا سن وفات ۱۱۶۱ھ ہے۔

۲؎ مرزا مظہر جانجاناں

آپ کا پورا نام شمس الدین حبیب اللہ ہے۔ موصوف علوی سادات کے ایک مرتبہ خانوادے سے تھے۔ آپ کے آباؤ اجداد کا شمار امرائے شاہی میں سے ہوتا تھا اور تیموری سلاطین سے بھی آپ کی قرابت تھی۔ آپ ہر فن اور تمام علوم ظاہری میں بہرہ کامل رکھتے تھے۔ چہار شنبہ ۷ محرم الحرام ۱۱۹۵ھ کا واقعہ ہے کہ رات کا ایک حصہ گزر چکا تھا کہ آپ کی خانقاہ پر چند لوگوں نے دستک دی خادم نے عرض کیا کہ چند لوگ زیارت کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں آپ نے فرمایا کہ انہیں آنے دو۔ چنانچہ تین آدمی اندر آگئے۔ ان میں سے ایک مغل زادہ تھا جس نے چہرہ دیکھتے ہی آپ پر حملہ کیا اور دل کے قریب کاری زخم لگایا۔ اس کے بعد تین روز تک آپ زندہ رہے اور جمعہ کی شام کو جان جان آفریں کے سپرد کی۔ (خزینۃ الاصفیاء)

مولانا سندھی کے غیر مطبوعہ مسودہ کتاب "التمہید" میں ہے "امام ربانی کے طریقہ مجددیہ کے اکابر میں سے ایک امام شمس الدین حبیب اللہ مظہر جانجاناں ہیں۔ آپ شاہ ولی اللہ کے ہم عصر تھے۔ شیخ محمد اپنی کتاب تاریخ جن میں امام ربانی کے ذکر کے بعد        لکھتے ہیں کہ ان کے بعد آنے والے ان کے جلیل القدر اصحاب میں سے ایک بزرگ شمس الدین المظہر معروف بہ جانجاناں شہید دہلوی ہیں۔ آپ حضرت علیؓ کے صاحبزادہ محمد بن الحنفیہ کی اولاد میں سے تھے۔ موصوف بے شمار فضیلتوں کے حامل تھے۔ آپ نے حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے حدیث پڑھی تھی اور مجددی طریقہ امام ربانی کے چوتھے نائب مرتبت پیروں سے حاصل کیا تھا۔ اتباع سنت اور کشف و قربت میں آپ کا بلند مقام تھا۔ دہلی کے اساتذہ شیخ سیالکوٹی، امام ولی اللہ اور (مولانا) فخر الدین الہ آبادی ایسے ائمہ تصوف اور محدثین نے آپ کے علم و فضل اور جلالت شان کی شہادت دی ہے۔ مشہور محدث محمد حیات

ندعی ثم مدنی کا قول ہے کہ اگر کوئی حدیث فقہ حنفی کے معمول بہ کے خلاف وارد ہو اور مرزا جانجاناں اس حدیث کی توثیق کریں تو اس کے باوجود بھی اس حدیث پر عمل کرنا چاہیئے۔ آپ نے ۱۰ محرم میں شہادت پائی۔ آپ کی شہادت کی تاریخ "عاش حمیداً و مات شہیداً" مشہور حدیث سے نکالی گئی ہے۔ مرزا جانجاناں کے جلیل القدر اصحاب میں سے قاضی ثناء اللہ نومی ثم عثمانی ہیں آپ پانی پت کے رہنے والے تھے اور بہت بڑے فقیہ، اصولی، زاہد اور مجتہد تھے۔ آپ نے حنفی فقہ میں بعض مسائل کا خود استخراج فرمایا تھا۔ فقہ، تفسیر اور زہد کے مسائل پر آپ کی بعض مشہور تصنیفات بھی ہیں۔ موصوف کے استاد مرزا جانجاناں آپ پر فخر کیا کرتے تھے۔

"التفہیمات" میں ہے کہ مرزا جانجاناں مظہر اور امام ولی اللہ آپس میں دو بھائیوں کی طرح تھے جو ایک دوسرے سے راضی ہوں اور ایک دوسرے کی مدد کریں۔ سرزمین دہلی اب تک ان دو بزرگوں پر نازاں ہے۔ امام مظہر جانجاناں نے دہلی کے کسی شیعہ امیر کے نوکر کے ہاتھ سے ۱۱۹۵ھ میں شہادت پائی۔

آپ کا ایک شعر ہے :-

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

امیر الروایات میں ہے کہ حضرت مرزا صاحب کے قتل میں نجف علی خان حاکم دہلی کا ہاتھ تھا۔ جو مذہباً رافضی تھا۔ (بحوالہ شیخ حسن صفحہ ۲۰۰)

## ۲۔ مجتہدانہ کمال

تجدیدی انقلاب کے لئے حدیث و فقہ میں مجتہدانہ کمال ضروری امر ہے۔ اجتہاد کے متعلق شاہ ولی اللہ "مصفیٰ" میں لکھتے ہیں "ہر زمانے میں اجتہاد فرض کفایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن یہاں اجتہاد سے مقصود اجتہاد مستقل نہیں جیسے کہ امام شافعی کا اجتہاد تھا۔ ہمارا یہ کہنا کہ ہر زمانہ میں اجتہاد فرض ہے، اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ چونکہ مسائل آئے دن نئے سے نئے پیدا ہوتے رہتے

ہیں۔ ان کے بارے میں احکام الٰہی کا جاننا ضروری ہے اور جو کچھ پہلے مدون اور مرتب ہو چکا ہے وہ کافی نہیں ہوتا۔ پھر اس میں بھی بہت اختلاف ہوتا ہے۔ یہ اختلافات اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے، جب تک دلائل کی طرف رجوع نہ کیا جائے۔ اور مشکل یہ ہوتی ہے کہ ان دلائل کا سلسلہ اصل مجتہدین تک جایا نہیں جا سکتا۔ ان حالات میں اس کے سوا اور کوئی صورت ممکن نہیں ہوتی کہ مسائل کو اجتہاد کے اصولوں پر پرکھا جائے۔"

جب تک کوئی انسان اپنے فکر پر مستقل اعتماد نہ رکھتا ہو، وہ کوئی انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔ استقرارِ فکر کے تین درجے ہیں۔ اول شریعت میں خلافتِ راشدہ کو امام بنانا ضروری ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو اس سے بھی مستغنی کرے اور قرآن حکیم کو اپنے مستقل فکر سے حل کرنا چاہے، اسے ہم مجتہدین میں شمار نہیں کرتے۔ وہ در اصل اپنی موروثی ذہنیت کو قرآن کا لباس پہنا دیتا ہے۔ خلافتِ راشدہ کا اتباع کرنے والا ایک حکیم اگر اپنا مستقل فکر رکھتا ہے۔ اس کے فکر میں اور خلافتِ راشدہ میں کوئی اور واسطہ نہیں، اور وہ خلافتِ راشدہ سے دستورِ عمل کو پڑھ کر اپنے فکر سے تطبیق دے دیتا ہے تو یہ ہے مجتہد مطلق مستقل۔ اس کی مثال ائمہ ثلاثہ ہیں۔ امام احمد کو ہم امام شافعی کے اتباع میں شمار کرتے ہیں۔ اگر امام شافعی کے مذہب کے ساتھ امام احمد کا مذہب ملا کر مدون کر دیا جائے تو یہ ایک بڑی چیز ثابت ہوگا، جیسے صاحبین کا مذہب امام ابو حنیفہ کے مذہب سے مل کر بہت بڑی چیز بن گیا ہے اور اس نے چار دانگ عالم کو مسخر کر رکھا ہے۔

"ہمارے نزدیک امام احمد کے مذہب کی حیثیت امام شافعی کے مذہب کے تتمہ کی سی ہے اس بارے میں شاہ ولی اللہ اپنی کتاب "الانصاف" میں فرماتے ہیں "امام احمد کا مذہب امام شافعی کے مذہب کے ساتھ اسی طرح متعلق ہے، جس طرح امام ابو یوسف اور امام محمد کا مذہب ابو حنیفہ کے ساتھ۔ البتہ جس طرح ان دونوں صاحبوں کا مذہب امام ابو حنیفہ کے مذہب کے ساتھ مدون کیا گیا ہے، اسی طرح امام احمد کا مذہب امام شافعی کے ساتھ جمع نہیں کیا گیا۔ اس لیے ان دونوں کا شمار الگ الگ کیا جانے لگا۔ اب بھی اگر کوئی کوشش کرے تو ان دونوں مذہبوں کو باہم

مدوّن کرنا زیادہ مشکل نہیں رہا (تمہید)

ہم توقع رکھتے ہیں کہ حنبلی مذہب کے فقہا امام شافعی کے مذہب میں تبحر حاصل کریں گے اسی طرح شافعی مذہب کے فقہا حنبلی مذہب کے متبحر ہوں گے۔ اور اسی طرح اگر حنفی مذہب والے اور مالکی مذہب والے بھی دونوں آپس میں ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں تو امت اسلامیہ کے لئے اس میں بڑا فائدہ ہوگا۔

استقرار فکر کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ ایک مجتہد مستقل کو استاد مان کر یہ فن اس سے سیکھ لیا جائے۔ مگر استاد کی طرح اس عالم کا اجتہاد بھی براہ راست خلافت راشدہ پر ہو۔ جیسے صاحبین۔ ایسے ائمہ کو مجتہد منتسب کہا جاتا ہے۔ یہ دوسرا درجہ ہے اجتہاد کا۔ اور انقلاب کے لئے کم از کم اس درجہ کا مجتہد ہونا ضروری ہے۔

استقرار فکر کا ایک تیسرا درجہ تجویز کیا گیا ہے۔ جسے مجتہد فی المذہب کہتے ہیں۔ اس کا تعلق خلافت راشدہ سے نہیں ہوتا۔ مجتہد مستقل اور اس کے اتباع میں جتنے مجتہد منتسب پیدا ہو گئے ان کے اختلافات کو یہ ایک اصول کے اندر حل کر دیتا ہے۔ اس لئے ایک مذہب کی کتابیں پڑھانے میں یہ استاد کامل ہوتا ہے۔ نیز یہ شخص حکومت اسلامی کے داخلی انتظام کے لئے قاضی و مفتی بننے کے لئے بہت کارآمد ہے۔ یہی نظام داخلی کو مستحکم بنا دیتا ہے۔ جیسے حنفیہ میں شمس الائمہ سرخسی وغیرہ ائمہ حنفی مذہب میں جس قدر مجتہد گزرے ہیں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ خراسان کے ایک ایک گاؤں میں دس دس مجتہد فی المذہب گزرے ہیں۔ اور مذہب حنفی کی بقا اور استحکام کی یہی وجہ بھی ہے۔ سلطنتیں مٹ گئیں مگر عوام میں مذہب حنفی موجود و محفوظ ہے اور اس کی مخالفت ترک اسلام کے مترادف سمجھی جاتی ہے۔

## شاہ صاحب کا الہامی خواب

اصل خواب فیوض الحرمین صفحہ ۹۹ میں مذکور ہے۔ استبدادی حکومتوں کا خاصہ ہے کہ حکمران کے ماسوا کوئی شخص سیاسیات پر رائے زنی نہیں کر سکتا۔ اس لئے حکمائے اسلام کا ایک طبقہ ہمیشہ رمزی

کا مذاق رکھتا ہے، اپنی منظوم تصانیف میں قصص و حکایات یا مدح و نصائح کی صورت میں اپنی رائے ظاہر کرتا ہے۔ جنہیں اس طرح اظہار خیالات کا موقع نہیں ملتا، ان کے افکار صادقہ کا سلسلہ واقعات مستقبل کی صورت اختیار کر کے خواب میں نظر آتا ہے۔ اُن کے معتقد اس بشارت کو سنتے ہیں۔ اس کی تعبیر میں غور کرتے ہیں اور حقیقت واقعہ عریاں ہو کر نظر آنے لگتی ہے۔

شاہ صاحب نے اپنا انقلابی نظریہ حجاز میں مکمل کر لیا تھا۔ جسے آپ نے "فیوض الحرمین" میں ایک خواب کی شکل میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ شب جمعہ ۲۱ ذیقعدہ ۱۱۴۴ھ کو میں نے مکہ معظمہ میں خواب دیکھا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے اس زمانے کا نظام قائم رکھنے میں ایک واسطہ بنایا ہے۔ میں نے دیکھا کہ کفار کا سردار مسلمانوں کے شہروں پر غالب آگیا ہے۔ اس نے ان کے اموال لوٹ لئے اور انہیں قید کر لیا۔ اجمیر جیسے شہر میں کفر کے خصوصی احکام جاری کر دیئے اور اسلامی قانون کے خاص کام ممنوع قرار دیئے۔ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے متاثر ہو کر میں غضب سے بھر گیا اور میرے غضب کا اثر اس ہجوم میں بھی پھیل گیا، جو میرے گرد جمع ہو رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اس وقت خدا تعالیٰ کی رضا کس طرح ہو سکتی ہے۔ میں نے جواباً کہا۔ "فَكُّ كُلِّ نِظَامٍ" یعنی تمام بوسیدہ نظاموں کو توڑ دو۔ اس کے بعد وہ ہجوم آپس میں جنگ شروع کر دیتا ہے۔ پھر میں ایک شہر کے قریب پہنچا تا کہ اس کو برباد کر دوں۔ اُدھر وہ لوگ بھی میرے پیچھے پیچھے چلے آئے اور لگاتار شہروں کو برباد کرتے ہوئے اجمیر پہنچ گئے۔ یہاں میں نے دیکھا کہ ان لوگوں نے کفار کے سردار کو ذبح کر ڈالا اور اس کی رگہائے گردن سے خون بڑے زور سے بہہ رہا ہے۔

اس خواب کی تعبیر میں غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت کی شکست کی طرف اشارہ ہے۔ اور شاہ ولی اللہ ایک طرح پر اس کے سرانجام دینے کا واسطہ ہیں۔ اجمیر کا ذکر اس لئے آتا ہے کہ دہلی کا روحانی مرکز اجمیر تھا۔ خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہ، اجمیر میں تشریف لائے اور یہیں سے اشاعت اسلام کا کام شروع کیا جس کے نتیجہ میں دہلی فتح ہوئی۔ اس خواب کے دو سال بعد ۱۱۴۶ھ میں باجی راؤ شمالی ہند پر حملہ آور ہوا۔ ادھر ۱۱۵۱ھ میں

نادر شاہ کی یلغار سے تمام سابقہ انتظامات کمزور ہونا شروع ہوئے۔ نادر شاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اس سلسلے کو جاری رکھا جس میں مسلمانوں کی خانہ جنگی اور ان کے نظام سلطنت کی بوسیدگی ظاہر کرنے کے ماسوا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ مگر اسی احمد شاہ نے ۱۱ ذیقعدہ سنہ ۱۱۷۴ھ میں پانی پت پر مرہٹوں کا خاتمہ کر دیا۔

ہندوستان کے جن مسلمان امیروں نے احمد شاہ کو اس حملہ کی دعوت دی تھی، ان میں نواب نجیب الدولہ پیش پیش تھے۔ یہ تاریخی حقیقت سب کو معلوم ہے کہ نواب نجیب الدولہ شاہ ولی اللہ کے خاص مسترشدین میں تھے۔

اس واقعہ کے قاعدے "فک کل نظام" کو شاہ ولی اللہ نے اپنے انقلابی نظریے کا محور قرار دیا اور تفسیر و حدیث و فقہ و تصوف کی تمام کتابوں میں جو کیا ہے کے قریب ہیں مناسب مواقع پر اجماع کے فساد کی تفصیل اور انقلاب کی ضرورت پر کافی بسط سے بحث کی ہے۔

## شاہ صاحب کی مستقل امامت

شاہ ولی اللہ کے اصول کو چھوڑ کر کوئی شخص اسلام کی علمی طاقت کو محفوظ رکھنا چاہے تو کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ نیز ان کے سیاسی اصول ترک کر کے حکومت بنانا چاہے گا تو یقیناً ناکام رہے گا۔ "تفہیمات الٰہیہ" صفحہ ۱۱ میں ہے کہ "مجھے تقرب الی اللہ کا ایک نیا طریقہ عطا کیا گیا ہے جس سے تمام پرانے طریقے منسوخ ہو گئے ہیں۔ لوگوں کو پرانے طریقوں سے محبت ہے، جس سے ان کو ایک قسم کی لذت محسوس ہوتی ہے مگر تقرب الی اللہ ان طریقوں سے حاصل نہیں ہو سکتا"۔

یہاں پر اس قدر تنبیہ کرنے کی ضرورت ہے کہ امام ولی اللہ اپنے طریقے میں خدا یاد کرنے کے اشتغال اور حکومت بنانے کے قوانین، ہر دو چیزوں کو ایک مرتبہ پر جمع کر دیتے ہیں۔ انہوں نے حکومت کا نام خلافت ظاہرہ رکھا ہے اور حکومت پیدا کرنے والی جماعت کا نام خلافت باطنہ تجویز کیا ہے۔ آج کی اصطلاح میں اگر اس کا ترجمہ کیا جائے تو پہلے درجے کو گورنمنٹ کہا جائے گا۔ اور دوسرے درجے کو وہ پولیٹیکل پارٹی جو اس گورنمنٹ کو پیدا کرتی ہے۔

یہ دونوں چیزیں سیاست میں آگے پیچھے نہیں کی جا سکتیں بلکہ مساوی عزت کی مستحق ہیں شاہ صاحب ان کے لیے وہ خصوصی سیاسی لفظ جو اسلام میں مستعمل تھا یعنی "خلافت" استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کے دو حصے بنا کر دونوں جماعتوں کو ایک نقطے پر جمع کرنا چاہتے ہیں ان کی پولیٹیکل پارٹی کے لیے ذکر و فکر ضروری ہے ورنہ وہ دینی حکومت کبھی پیدا نہیں کر سکے گی۔

وہ جس وقت "اپنا طریقہ" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس میں ان کی ساری تحریک علمی ہو یا اخلاقی، وجدانی ہو یا سیاسی، سب کی سب یکساں داخل ہے۔

اس تنبیہ کے بعد ہمارا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ شاہ صاحب کے خلاف ذکر و فکر کا کوئی طریقہ تقرب الی اللہ کا ذریعہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح شاہ صاحب کے اصول کو چھوڑ کر کوئی سیاسی تحریک دینی حکومت پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہوگی۔ شاہ صاحب کے مذکورہ ذیل جملوں کا مطلب ہم یہی سمجھتے ہیں کہ طریقت و اشتغال اور مذہب و سیاست سب چیزیں ان ہی کے اتباع میں تقرب الی اللہ کا باعث ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

"اس مذہب کے بعد تو کوئی ایسا مذہب نہیں دیکھے گا اور اس کے طریقہ سلوک کے ماسوا تجھے کوئی طریقہ نظر نہ آئے گا جو "جذب" کی اصل روح پر مشتمل ہو۔ بے شک بہت سے اہل طرق اور اصحاب مذاہب ضرور ہیں جو اپنے اپنے طریق اور مذہب کے پابند ہیں، نیز جن سلوک کی راہوں پر وہ گامزن ہیں، وہ ایک حد تک مفید اور کارآمد بھی ہیں۔ لیکن "جذب" کی صحیح روح اُن کے ہاں مفقود ہے۔ یہ ہے وہ روز قیامت جس سلسلے میں کہ اس بدوحی کو مبعوث کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا اور اس کے عالم وجود میں آنے کے لیے یہ شرط کی گئی تھی" صفحہ ۱۴۸ تفہیمات

الغرض یہ تصریحات بظاہر طریقت کے لیے لکھی گئی ہیں، مگر ہمارے نزدیک شاہ ولی اللہ سیاسی اصول میں بھی دنیا بھر کے امام ہیں۔ ہندوستان تو ایک طرف رہا، یورپ میں بھی ان کے اصول سے ہٹ کر کوئی حکومت نہیں رہ سکتی۔ ہم اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھوا سکتے ہیں، مگر ہمارے ملک کی فضا اس کے موافق نہیں ہے۔

## ۲۔ مدرسہ شاہ ولی اللہ

شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنے والد کی وفات کے بعد مدرسہ رحیمیہ میں جس کی بنیاد شاہ عبدالرحیم ڈال گئے تھے طلبہ کو درس دینا شروع کیا۔ بارھویں صدی کے آغاز اور گیارھویں کے اختتام پر شاہ عبدالرحیم نے پرانی دہلی میں اس مقام پر ایک مدرسہ قائم کیا جو اب مہندیوں کے نام سے مشہور ہے اور اس کا نام مدرسہ رحیمیہ رکھا (حیات ولی صفحہ ۲۲)

شاہ ولی اللہ صاحب کے علمی کمال کا شہرہ بڑھا اور طلبہ اطراف واکناف سے آنے لگے تو مدرسہ رحیمیہ ان کے لیے ناکافی ثابت ہوا۔ سلطان محمد شاہ نے امام ولی اللہ کو بلا کر شہر میں ایک عالیشان مکان دے کر دار الحدیث کا اس میں افتتاح کرایا۔ اس کے بعد قدیم جگہ غیر آباد ہو گئی یہ مدرسہ کسی زمانے میں نہایت عالیشان اور خوبصورت تھا اور بڑا دارالعلوم سمجھا جاتا تھا۔ اس کے استحکام کی یہ حالت تھی کہ شورش ۱۸۵۷ء تک اپنی اصلی حالت پر قائم رہا۔ اگر اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش نہ آتا کہ اس شورش میں مکانات لوٹ لیے گئے اور کئی برس تک لوگ اٹھا کر لے گئے تو آج بھی شاید وہ باقی رہتا۔ اس کی وسعت اور کشادگی کا یہ عالم تھا کہ اب متفرق لوگوں کے مکانات اس جگہ بن گئے ہیں۔ مگر محلہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسہ کے نام سے مشہور ہے اور آج تک پکارا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے بعد ان کے چاروں صاحبزادوں نے یہی مشغلہ درس و تدریس جاری رکھا اور اس مدرسے نے تعلیم و خدمت میں وہ نام پیدا کیا کہ ہندوستان میں شہرہ ہو گیا۔ جب شاہ صاحب کے صاحبزادوں میں کوئی نہ رہا تو مولانا محمد اسحاق صاحب نے مدرسہ کی خدمت اپنے ذمہ لی۔ اس مدرسہ کی عمارت کا حال شاہ عبدالعزیز صاحب اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

"و در آں متقدمین بزرگان بسیار و اولیا مدفون اند [illegible] والد محقق [illegible]" (ملفوظات شاہ عبدالعزیز صفحہ ۹۰) جب مولانا محمد اسحاق نے سنہ ۱۲۵۸ھ میں ہجرت کی تو مولانا مخصوص اللہ اور مولانا موسیٰ خلف مولانا رفیع الدین درس کی نگرانی فرمانے لگے۔ ان حضرات کے انتقال کے بعد

مولانا موسیٰ صاحب کے ایک صاحبزادے میاں عبدالسلام بہت صغیر سن بچے اور ایک صاحبزادی رہ گئیں۔ خاندان بھر میں کوئی ایسا نہ تھا جو عبدالسلام صاحب کو پڑھاتا لکھاتا۔ غرض یہ سلسلہ جو کئی پشت سے اس خاندان میں جاری تھا بند ہو گیا۔ اب چونکہ یہ کل جائداد راجہ بہادر لالہ شیو پرشاد کی ہے اس لیے اس گلی پر بعد میں راجہ بہادر لالہ رام کشن داس کا تختہ لگا دیا گیا ہے۔ (ماخوذ از کتاب

"دارالحکومت دہلی" حصہ ۳ صفحہ ۱۴۶ از مولوی بشیر الدین صاحب)

## ۱ہ مولانا محمد عاشق پھلتی

(مولانا سندھی اپنی کتاب "التمہید" (حصہ اردو) میں فرماتے ہیں۔ عام طور پر صدہا اہلِ علم شاہ ولی اللہ صاحب سے مستفید ہوتے، حرمین شریفین سے باہر مذاق عالم ان سے علم سیکھنے کے لیے وہاں آتے رہے۔ لیکن ان کے مکمل نظریے کو سمجھنے والے تین چار رفقاء سے زیادہ نہیں ہیں۔ (۱) ان کے ماموں زاد بھائی شاہ محمد عاشق (۲) جمال الدین شاہ محمد امین ولی اللہی کشمیری (۳) شاہ نور اللہ بڈھانوی (۴) شاہ ابوسعید بریلوی۔ پہلے تین حضرات شاہ عبدالعزیز کے استاد ہیں۔ چوتھے شاہ ابوسعید خلیفہ شاہ ولی اللہ اور حضرت سید احمد شہید امیر شہید حضرت شاہ ابوسعید کے نواسے تھے۔ (صفحہ ۲۲)

امام ولی اللہ تفہیمات الٰہیہ (صفحہ ۲۹۹ و صفحہ ۱۴۳) میں لکھتے ہیں۔ شیخ محمد عاشق شیخ عبید اللہ کے صاحبزادہ ہیں اور شیخ عبید اللہ کے والد شیخ محمد قدس سرہ میرے نانا تھے۔ بچپن ہی سے شیخ محمد عاشق کو مجھ سے محبت تھی۔ میرے والد شاہ عبدالرحیم میرے ساتھ شیخ محمد عاشق کو اللہ کی خوشنودی کی راہ میں اس طرح باہم دگر دوست پا کر خوش ہوتے اور فرماتے کہ آگے چل کر اس دوستی سے بڑا کام سرانجام ہوگا۔ شیخ عاشق کو مجھ سے طریق حق طلب کرنے کی خدا نے توفیق دی۔ ان کا ظاہر و باطن، دل و جسم اور زبان میری محبت میں رنگے گئے اور وہ ہمہ تن مجھ سے اخذ علم کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ موصوف اس راہ میں برابر آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ان کی روح پورے طور پر بیدار ہو گئی۔ اور میں نے دیکھا کہ انہیں کامل ادراک اور مکمل احاطۂ علم ہو گیا ہے۔

چنانچہ مجھے اس طرف سے پورا یقین ہے کہ نہ اُن کے حالات کبھی پلٹا کھائیں گے اور نہ ان کے اقوال میں تذبذب پیدا ہوگا۔ میں نے دیکھا ہے کہ میرے اور ان کے درمیان جو دروازہ تھا وہ اس طرح کھل گیا ہے کہ جو کچھ وہ مجھ سے اخذ کرتے ہیں، اس میں مطلق تقلید کا رنگ نہیں ہوتا۔ یوں سمجھ گویا کہ میں اور وہ دونوں ایک ہی سرچشمہ سے اخذ علم کرتے ہیں۔

شیخ عاشق کے اخلاق، ان کے اعمال اور ان کے اطوار سب پسندیدہ اور مرغوب ہیں۔

وہ بحمد اللہ میرے خیر خواہ ہیں، میرے علم کے راز داں ہیں۔ میرے اسرار کے محافظ ہیں، اور میری کتابوں کے نگراں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کتابوں کو صفحۂ قرطاس پر لانے کے وہ سبب اور باعث بنے۔ اور انہوں نے ان کتابوں کے مسودوں کو صاف بھی کیا۔ میرا خیال ہے کہ میرے علوم ان کی وجہ سے ہی لوگوں میں باقی رہیں گے۔ مجھے یہ الہام ہوا ہے کہ لوگوں میں ان کا ذکر خیر عام کردوں، اور ان کی سربستہ صلاحیتوں کو پردۂ راز میں نہ رہنے دوں۔ میں نے ان کو اپنا خرقۂ تصوف پہنا دیا ہے جیسا کہ میرے والد بزرگوار نے مجھے اپنا خرقہ پہنا دیا تھا اور جیسا کہ ان کے علاوہ ابوطاہر مدنی نے اپنے خرقہ سے مجھے سرفراز فرمایا تھا۔ حضرت ابوطاہر کا خرقہ تمام اولیاء کے خرقوں پر جامع تھا۔ میں نے شیخ محمد عاشق کو اجازت دی ہے کہ وہ دوسروں کو تصوف کے ان اشغال کی تلقین کریں، جو انہوں نے مجھ سے سنے ہوں۔ اس کے علاوہ ان اشغال کی بھی جو مجھ سے نہ سنے ہوں۔ نیز وہ راہِ سلوک کے طالبوں کو جو اُن کے مرید ہوں، جیسے ان کی مرضی ہو علاج اور ہر طریقے سے "فتوح" قبول کریں۔ نیز حدیث، تفسیر اور باقی دینی علوم جو انہوں نے مجھ سے پڑھے ہیں یا جو ہم دونوں حرمین کے مشائخ سے ایک ساتھ پڑھتے رہے ہیں۔ دوسروں کو پڑھائیں۔

"انفاس العارفین" میں شیخ محمد عاشق کے متعلق امام ولی اللہ کا ارشاد ہے۔ فرماتے ہیں۔

"والد بزرگوار نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ایک دفعہ اس فقیر اور شیخ محمد عاشق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ دونوں باہم دگر دوستی رکھتے ہیں اور ان کی اس دوستی سے مجھے بڑی خوشی اور مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس ارشاد کی حقیقت مجھ پر بعد میں ظاہر ہوئی۔ چنانچہ ہوا یہ کہ اس طرح

کو فقیر کے ساتھ رابطۂ طریقت پیدا ہو گیا اور موصوف میرے شیخ بن گئے۔ مجھے امید ہے کہ یہ دوستی بے شمار فوائد کا باعث ثابت ہو گی۔"

شاہ عبدالعزیز "عجالۂ نافعہ" میں لکھتے ہیں "والد ماجد کے بعد میں نے ان کے عالی مرتبت ساتھیوں مثلاً محمد عاشق اور خواجہ محمد امین ولی اللہی سے علم حاصل کیا۔ شیخ محمد عاشق نے والد ماجد کے ساتھ شیخ ابوطاہر اور حرمین کے دوسرے مشائخ سے اخذ علم کیا تھا" (صفحہ ۱۰)

شیخ محسن "الیانع الجنی" میں لکھتے ہیں "شیخ ولی اللہ کے جلیل القدر اصحاب میں سے ایک شیخ محمد عاشق ہیں۔ موصوف حجاز میں شاہ صاحب کے شریک سبق بھی رہ چکے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں سے علم سلوک پر ایک مشہور کتاب ہے۔ ان کے بعد شیخ محمد امین کشمیری ہیں جو اصل میں بخارا کے تھے اور دہلی میں بس گئے تھے۔ آپ اپنے استاد کی طرف منسوب ہوتے تھے اور اسی نسبت سے مشہور عام و خاص تھے۔ ان دونوں بزرگوں سے شاہ عبدالعزیز نے پڑھا جیسا کہ وہ اپنی کتاب "عجالۂ نافعہ" میں بیان کرتے ہیں (صفحہ ۹۹)۔

تیسرے مولانا نور اللہ بڈھانوی۔ آپ امام ولی اللہ کے تلامذہ میں سے تھے۔ تفہیمات جلد اول صفحہ اول پر شاہ صاحب نے ان کو جو اجازت نامہ لکھ کر دیا ہے، مفصل موجود ہے۔ فقہ حنفی میں شاہ عبدالعزیز کے استاد تھے اور آپ شاہ عبدالعزیز کے خسر بھی تھے۔ ان کے بیٹے مولانا ہبۃ اللہ ہیں جن کے صاحبزادے مولانا عبدالحی ہیں۔ مولانا عبدالحی شاہ عبدالعزیز کے تلامذہ میں ان کے بھائیوں کے بعد سب سے بڑے آدمی ہیں۔ "انفاس العارفین" میں جو شاہ عبدالرحیم کے حالات پر مشتمل ہے مولانا نور اللہ کے جستہ جستہ حالات موجود ہیں۔

## شاہ صاحب اور نجیب آباد

احمد شاہ ابدالی کو دعوت دینے میں نواب نجیب اللہ خاں اور نواب حافظ الملک رحمت خاں والی بریلی وغیرہ امراء شریک تھے۔ حافظ الملک کی سرکار سے سینکڑوں طلبہ کو ماہوار امداد ملتی تھی جو شاہ صاحب کے مدرسہ میں تعلیم پاتے تھے۔ نواب نجیب الدولہ شاہ ولی اللہ کے خاص مسترشدین میں سے

کے دارالمعارف میں ہے کہ آپ کے انتقال کی رات عالمگیر نے خواب میں دیکھا کہ آج رات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔ بادشاہ کو اس خواب سے بہت تشویش ہوئی علماء سے تعبیر دریافت کی تو انہوں نے کہا کہ تاریخ لکھ لینی چاہیئے۔ اس رات کو سید علم اللہ صاحب کی وفات ہوئی ہو گی کیونکہ وہی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہ ہیں۔ سرکاری وقائع نگار کی اطلاع سے معلوم ہوا کہ اسی شب کو سید صاحب نے انتقال فرمایا۔

سید احمد بریلوی شہید کی ولادت اسی دائرے میں، جو اب تکیۂ علم اللہ کے نام سے مشہور ہے صفر ۱۲۰۱ھ میں اپنے والد سید محمد عرفان کے گھر ہوئی۔

## ۱۳۔ شیخ معین الدین ٹھٹوی

الشیخ معین الدین ٹھٹوی عرف مخدوم ٹھارو (دفینہ مکلی) مخدوم محمد ہاشم اور ان کے صاحبزادے عبداللہ کے استاد ہیں۔ شیخ عبدالحق دہلوی کے طریقے کے خلاف شاہ ولی اللہ کے طریقے کو ترجیح دینے کے لیے آپ نے "دراسات اللبیب" لکھی۔ اس کتاب کا "الدراسۃ الثانیۃ عشر" خصوصی طور پر مطالعہ کرنا چاہیئے، جس میں انہوں نے امام بخاری کی تاریخ صغیر کی اس عبارت کا رد لکھا ہے، جہاں انہوں نے امام ابو حنیفہ پر جرح کی ہے۔ کتاب مذکور لاہور میں طبع ہو چکی ہے۔ اہل حدیث ہی نے طبع کرائی۔ اس کا رد شیخ عبداللہ مذکور نے لکھا جس میں شیخ عبدالحق کے طریقے کی ترجیح ہے۔ کتاب کا نام "ذب الذبابات عن الدراسات" ہے۔ دارالرشاد سندھ میں اس کا ایک نسخہ خطیہ موجود ہے۔ پورا تذکرہ شاہ معین الدین کا تحفۃ الکرام (تاریخ سندھ) میں موجود ہے۔ کتاب مطبوعہ ہے۔ کراچی مدرسہ مظہر العلوم میں کتاب موجود ہے۔ ومن شعرہ ؂

شکست راز خون دل وارم کہ با من آشنا گردد
ندانستم ز غفلت بد کہ او دیوانہ خواہد شد

## ۱۴۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی

شاہ عبداللطیف بھٹائی کی کتاب "رسالہ" مطبوعہ سندھی زبان میں وہی درجہ رکھتا ہے جو فارسی

میں مثنوی مولانا روم کا ہے۔ اس کو ہندو اور مسلمان سب مساوی طور پر پڑھتے ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں بھی ہو چکا ہے۔

شاہ محمد معین مصنف "دراسات اللبیب" اور شاہ عبداللطیف ہم مسلک بزرگ ہیں۔ اور وحدۃ الوجود کے دونوں یکساں عارف ہیں۔ شاہ محمد معین جب فوت ہونے لگے تو آپ نے وصیت فرمائی کہ میرا جنازہ تیار کر کے مسجد میں رکھ دیا جائے اور عبداللطیف کا انتظار کیا جائے۔ شاہ عبداللطیف معذور تھے۔ کیا معلوم کہ وہ کس صحرا میں ہوں۔ ان کو کس طرح اطلاع ملے اور کب پہنچیں۔ مگر جنازہ تیار ہونے کے تھوڑی دیر بعد آپ تشریف لے آئے اور امامت کرائی۔ بعدہٗ کہا کہ آج کے بعد ٹھٹھہ سے ہمارا تعلق منقطع ہو گیا ہے۔

کیپٹن الیگزنڈر ہملٹن نے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ شہر ٹھٹھہ (سندھ) میں مختلف علوم و فنون کے چار سو کالج تھے۔ علامہ مقریزی جو ہندوستان کی سیاحت کے لیے تشریف لائے اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ محمد شاہ تغلق کے عہد میں صرف دلی شہر میں ایک ہزار مدارس تھے۔ میکس مولر سرکاری کاغذات کی بنا پر لکھتا ہے کہ برطانوی حکومت سے قبل بنگال میں ۸۰ ہزار دیسی مدارس تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہوئے کہ آبادی کے ہر چار سو افراد کے لیے ایک مدرسہ قائم تھا۔ ریورنڈ وارڈ نے ۱۸۱۲ء میں بیان کیا تھا کہ انڈیا ڈسٹرکٹ سکولوں میں جو علم پڑھایا جاتا ہے وہاں ہر آٹھ سو لڑکوں پر ایک سکول ہے۔ (اقتباس از شیخ محسن)

## ملکی معرکہ پانی پت

امام ولی اللہ نے سنہ ۱۱۴۴ھ میں جو خواب دیکھا تھا اس کے دو حصے تھے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں میں نے دیکھا کہ بادشاہ کفار مسلمانوں کے شہروں پر قابض ہو گیا ہے۔ اس خواب کا مشاہدہ آپ کو یوں کرایا گیا کہ لال قلعہ پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا۔۔۔

سیر المتاخرین میں لکھا ہے کہ ذی الحجہ کی اخیر میں تاریخ کو لال قلعہ پر بدمست بھاؤ کا قبضہ ہو گیا اور حرم سرائے شاہی اور سلطنت کے سارے کارخانے بھی مرہٹوں کے تسلط میں آ گئے " ذالک تقدیر العزیز العلیم "

شاہ صاحب لکھتے ہیں پھر میں نے دیکھا کہ بادشاہ کفار مسلمانوں کے مال و دولت کو لوٹ رہا ہے" اس حصہ خواب کی تعبیر یہ ہے کہ جس وقت لال قلعہ پہ مرہٹوں نے قبضہ کیا تو انہوں نے بڑی لوٹ کھسوٹ کی۔ اس کا اندازہ سیر المتاخرین کی اس عبارت سے کیجئے " بھاؤ کی دنائت اور تنگ چشمی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ اس نے دیوان خاص کی چھت کو جس پر کہ چاندی کی مینا کاری تھی اکھڑوا کر پگھلا لیا اور قدم نبوی، مقبرہ نظام الدین اولیاء اور مرقد محمد شاہ پر جو سونے اور چاندی کے جھاڑ، ظروف، شمع دان اور قندیلیں رکھی ہوئی تھیں، ان کو لوٹا اور سب کو پگھلا کر سونے اور چاندی میں بدل لیا"

بھاؤ کی مذکورہ ذیل دنائت بھی قابل توجہ ہے۔ میر غلام علی نے خزانہ عامرہ کے صفحہ ۴۸ میں لکھتے ہیں " باجی راؤ باوجودیکہ وہ ہندوستان اور دکن کی سلطنت کا مالک بن چکا تھا، باجرہ کی روٹی کھاتا تھا اور اسے گندم کی روٹی اچھی نہ لگتی تھی۔ وہ کچے بینگن کچے آم اور کچے کرنے بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہو کہ برہمن کا اصل پیشہ چونکہ گداگری ہے اور ہندوؤں کے ہاں یہ دستور ہو چکا ہے کہ وہ برہمنوں کو صدقے دیتے ہیں۔ اس لیے اس قوم کی نسل بانسل سے دریوزہ گری عادت سی ہو گئی ہے۔ چنانچہ طماعی اور خود غرض کا بندہ ہونا برہمنیت کا خاصہ بن چکا ہے اور یہی سبب تھا کہ باجی راؤ سلطنت و امارت کی مسند پر بیٹھنے کے باوجود کشکول گدائی کے چکر سے نہ نکل سکا تھا۔ اس زمانہ میں یہ حالت تھی کہ اگر کوئی غرض مند اپنی ضرورت کے لیے برہمن حکام یا متصدیوں کے پاس جاتا تو ان میں سے ہر ایک کی نظر اس بات پر ہوتی کہ وہ ان کے لیے کیا لایا ہے ؎

بدست خلق عالم کاسہ دریوزہ می بینم

## گدا چوں بادشاہ گردد گدا سازد جہانے را

ان میں سے خواہ کوئی غنی ہوتا یا فقیر، ماہر کی دال پر اس کی غذا کا دار و مدار تھا۔ وہ دال بگھارتے تک بھی نہ تھے، نہ وہ اس میں اوپر سے گھی ڈالتے تاکہ اس طرح ہی دال کی خشکی دور ہو جاتی۔ وہ سرخ مرچ، ہینگ اور ہلدی بھر کھانے میں ڈالتے اور بڑی کثرت سے ان چیزوں کا استعمال کرتے۔ کھانا پکاتے وقت مرچ ڈال جاتی۔ اس کے علاوہ جب سالن کے ساتھ روٹی کھاتے تو کچی مرچ بھی ساتھ کھاتے جاتے تھے"۔

شاہ صاحب اپنا خواب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "بادشاہ کفار نے قصبہ اجمیر کے شہر میں کفر کے شعائر جاری کر دیئے۔ اس نے شعائر اسلام کو باطل قرار دیا"۔ وہی جس کا روحانی مرکز اجمیر ہے خواجہ معین الدین چشتی نے وہیں سے اشاعت و تبلیغ کا کام شروع کیا تھا جس کے نتیجے میں دہلی فتح ہوئی۔ اسی دہلی میں ملک الکفار کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اس نے یہاں شعائر کفر کا اعلان کر دیا اور شعائر اسلام کو ختم کر دیا۔ سیر المتاخرین کا مصنف لکھتا ہے کہ بھاؤ نے شاہجہان آباد کی قلعہ داری ناروشنکر برہمن کے سپرد کی اور ایک جماعت کو قلعہ کی حراست کے لیے اس کے ہمراہ بھیجا۔

الغرض امام ولی اللہ نے جیسے جیسے خواب میں دیکھا تھا، انہیں خصوصیات کے ساتھ ملک الکفار مسلمانان ہند پر غالب آیا اور ان کے مرکز سیاسی پر اس نے قبضہ کر لیا۔

اسی خواب کا دوسرا حصہ معرکہ پانی پت سے متعلق ہے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ احمد شاہ ابدالی نے یکایک ہندوستان پر حملہ کر کے مرہٹہ تحریک کو پانی پت کے میدان میں ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ سیر المتاخرین میں لکھا ہے "افواج دکن مع بھاؤ، وسواس راؤ اور دوسرے سرداروں سمیت اس معرکہ میں کام آئیں اور مرہٹوں کی سلطنت اس طرح بیخ و بنیاد سے اکھڑی کہ ہندوستان زمان شمالی ہند سے [illegible] میں ان کی جماعت کا اثر تک نہ رہا۔ اس کے بعد تمام قلمرو ہندوستان میں مرہٹوں کا ایک نفر بھی دیکھنے میں نہ آتا تھا"۔ دراصل اس کا سبب خواب مذکورہ بالا کا یہ نکلتا ہے،

جس میں شاہ صاحب فرماتے ہیں "میں نے خواب میں اپنے آپ کو یوں دیکھا، جیسا کہ میں "قائم الزمان" ہوں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو اس کو سرانجام دینے کے لیے وہ مجھے "جارحہ" یعنی ذریعہ بناتا ہے"

شاہ صاحب کے "جارحہ" ہونے کی یہ صورت ہوئی کہ سب سے پہلے بھاؤ نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے نواب شجاع الدولہ والی اودھ سے سازباز شروع کی۔ اس سلسلے میں اس نے اپنا ایک برہمن سفیر اس کے پاس بھیجا۔ اس کے جواب میں شجاع الدولہ نے کہا۔ "ایک مدت سے دکن کے برہمن ہندوستان پر مسلط ہو گئے ہیں۔ ان سے خدا کی خلق کو نہ آسائش پہنچی اور نہ وہ لوگوں کی آبرو کے روادار ہیں۔ ان کی ساری جدوجہد محض اپنی اغراض کو پورا کرنے کے لیے ہے۔ ان کے ہاتھوں خلقت تنگ آ چکی ہے۔ چنانچہ لوگوں نے اپنی ناموس کی خاطر اور اپنی آبرو بچانے کے لیے احمد شاہ ابدالی کو بڑی منت و سماجت کے بعد ولایت سے بلا بھیجا ہے۔ انہوں نے شاہ ابدالی کے حملے کے صدموں کو مرہٹوں کی ایذا سے آسان اور کم تکلیف دہ سمجھا ہے۔" اس کے بعد سیر المتاخرین کا مصنف نواب نجیب الدولہ وغیرہ امرائے ہند کے متعلق لکھتا ہے۔ "نواب نجیب الدولہ اور دوسرے امراء مرہٹوں کی وجہ سے پریشان تھے اور عماد الملک تو مرہٹوں کے ہاتھوں خود اپنی آنکھوں سے سلطنت کو جاتے دیکھ رہا تھا۔ چنانچہ ان سب نے احمد شاہ ابدالی کو عریضے لکھے اور اسے ہندوستان آنے کا بلاوا بھیجا۔"

اس کے بعد شاہ ولی اللہ کے خواب میں مذکور ہے۔ "دونوں فریق آپس میں لڑنے لگے۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ ان مسلمانوں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو آپس میں لڑ رہے ہیں۔ میں نے یہ سنا اور اس کا جواب نہ دیا۔" معرکۂ پانی پت کے سلسلے میں تاریخ ہند اس امر پر شاہد ہے کہ مرہٹوں کی اس جنگ میں مسلمانوں کی ایک جماعت ان کی فوج میں بھرتی ہو کر میدان جنگ میں لڑی۔ اس میں عرب اور ہندوستانی فوج کے علاوہ توپ خانہ کا سردار ابراہیم گاردی بھی تھا۔ اس نے عین معرکۂ جنگ میں ہمت کر کے توپوں کی زنجیر بندی

کی اور مرہٹوں کو کچھ دیر تک بچائے رکھا۔ سیر المتاخرین میں ہے: ۶ جمادی الآخر ۱۱۷۴ھ بروز
چہارشنبہ بھاؤ نے پانی پت کے میدان میں اپنی صفیں جمائیں اور ابراہیم خان کو فرنگی توپ خانہ
دے کر آگے کیا۔ ایک طرف مرہٹے ہر ہر مہادیو کے نعرے لگاتے ابدالی لشکر کی طرف بڑھے اور دوسری
طرف ابراہیم نے بڑے زور و شور سے توپوں سے گولہ باری کی۔ بھاؤ نے اپنے خاص رسالہ کو
آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ انہوں نے گھوڑوں کی باگیں اٹھائیں اور ابدالی کے لشکر پر ٹوٹ پڑے۔"

اس کے بعد خواب کا اگلا حصہ یہ ہے: "میں نے دیکھا کہ لوگوں نے ملک الکفار پر دھاوا
کرکے اس کو ذبح کر دیا ہے۔ جب میں نے خون اس کی رگوں میں بہتے دیکھا تو میں نے کہا۔
... الخ" تاریخ ہند مصنفہ سید ہاشمی میں مذکور ہے کہ بھاؤ نے دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد ارادہ
کیا کہ اپنے بھتیجے بسواس راؤ پسر بالاجی راؤ کو تخت دہلی پر بٹھا کر یہ اعلان کر دے کہ اب
ہندوستان کے تخت و نگین کے مالک مرہٹہ برہمن ہیں۔ مگر جنگ پانی پت کے خاتمہ
تک اس نے اس اعلان کو ملتوی کرنا مناسب سمجھا۔ مگر جنگ میں بسواس راؤ امیدوار تخت
و تاج اور تخت بخش بھاؤ ہر دو کام آئے۔ سیر المتاخرین کا مصنف اس واقعہ کے متعلق لکھتا ہے:
"ان بڑے بڑے سرداروں میں سے شہزادہ بسواس راؤ پسر بالاجی راؤ جس کا ابھی عین شباب تھا
گولے کا نشانہ بنا۔ اس کے بعد مرہٹوں کا سپہ سالار بھاؤ جو بالاجی راؤ کا چچازاد بھائی تھا ہلاک ہوا۔
غنیم کے بڑے سرداروں میں سے سوائے دو تین سو نفر کے کوئی بچ کر نہ جا سکا۔ اس شکست فاش
کے صدمے سے بالاجی راؤ بھی دل شکستہ ہو گیا اور دوسری دنیا کو سدھارا۔ وہ اپنے بیٹے اور
بھائی کے بعد کل ۵ ماہ زندہ رہا۔ ابراہیم خان گاردی میدان جنگ میں اسیر ہوا اور اس کا
سر تلوار سے اڑا دیا گیا۔" یہ ہے تعبیر خواب کے اس جملہ کی کہ "اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے کاموں
کے لیے بطور جارحہ بنایا۔" اور یہی معنی اس ارشاد کے ہیں کہ "میرے دل میں ذات اقدس کی
طرف سے ذکر اس عالم کی جہت سے یہ باتیں الہام کی گئی ہیں۔"

بہرحال شاہ صاحب نے خواب میں دیکھا تھا "ہم جمعہ تک پہنچے۔" بعینہٖ اسی طرح
ابدالی مع افواج قاہرہ کے شہروں کو فتح کرتا ہوا دہلی پہنچا۔ اسی مجادلہ کا تقاضا تھا کہ شاہ

ابدالی نے فتح کے بعد حکومتِ دہلی حق داروں کے حوالے کر کے خود سیدھا قندھار روانہ ہو گیا اور یہاں حکومت کرنے کا خیال تک اس کو نہ آیا۔

## ۱۲۔ خروج مہدی کا عقیدہ

امام ولی اللہؒ "ازالۃ الخفا" میں لکھتے ہیں "اب سوال ابن ماجہ کی مشہور حدیث کا ہے۔ اس حدیث کا اشارہ ابو مسلم کے خراسان سے نکلنے کی طرف ہے۔ اور اسی خلیفہ کو مہدی کہا گیا ہے، اور اسی کی نصرت کی ترغیب دی گئی ہے۔ ابن ماجہ کی حدیث یہ ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ بنی ہاشم کے چند نوجوان لڑکے آپ کی طرف آئے۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھا تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور چہرے کا رنگ بدل گیا۔ عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ آپ کے چہرے پر بے چینی کے آثار نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز آپ کو ناپسند ہے۔ آپ نے فرمایا۔ ہم اہل بیت کے لئے اللہ نے دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو چن لیا ہے اور میرے بعد میرے اہل بیت کو بڑی سخت تکلیفوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ وہ وطن سے بے وطن ہوں گے۔ اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں مارے مارے پھریں گے۔ میرے اہل بیت کی یہ حالت اس وقت تک رہے گی، جب تک کہ مشرق کی طرف سے ایسے لوگ نہ آئیں گے، جن کے پاس سیاہ جھنڈیاں ہوں گی، وہ خیر و بھلائی کا مطالبہ کریں گے لیکن وہ انہیں نہیں دی جائے گی۔ وہ لڑیں گے کامیاب ہوں گے اور جو کچھ وہ چاہتے تھے وہ ان کو مل جائے گا۔ یہ لوگ اس چیز کو قبول کر کے ایک ایسے شخص کے حوالے کر دیں گے، جو میرے اہل بیت میں سے ہوگا۔ یہ دنیا کو اس طرح عدل و انصاف سے بھر دے گا جیسے اس سے پہلے ان لوگوں نے ظلم و جور سے بھر دیا تھا۔ تم میں سے جس کو یہ زمانہ ملے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے پاس پہنچے خواہ اسے برف پر گھسٹ گھسٹ کر ہی آنا پڑے۔"

ابن ماجہ نے ثوبان سے ایک روایت کی ہے جس میں مذکور ہے کہ تین شخص جو سب کے

سب خلیفہ کے بیٹے ہوں گے لڑیں گے۔ اور جب ان میں سے ایک کے قبضے میں وہ کنز آ جائے گا تو مشرق سے سیاہ جھنڈیوں والے نکلیں گے۔ وہ تم سب کو قتل کریں گے۔ راوی کا بیان ہے کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا وہ مجھے یاد نہیں رہا۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم اس کو دیکھو تو اس کی بیعت کر لینا اور اس کے پاس برف پر گھسٹتے ہوئے پہنچنا۔ کیونکہ خلیفۃ اللہ مہدی وہی ہے۔ اسی مضمون کی ابن ماجہ نے ایک اور حدیث روایت کی ہے۔ عبد اللہ بن حارث بن جزء الزبیدی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مشرق کی طرف سے لوگ نکلیں گے جو مہدی کے لئے زمین تیار کریں گے۔

امام ولی اللہ ابن ماجہ کی ان تین حدیثوں پر بحث کرتے ہوئے "ازالۃ الخفا" میں لکھتے ہیں۔ فقیر کے نزدیک ان تین حدیثوں کی تحقیق یہ ہے کہ مہدی سے مراد بنو عباس کا خلیفہ مہدی ہے۔ اس مہدی سے وہ مہدی مقصود نہیں جو آخری زمانے میں ظاہر ہوگا۔ حدیث میں مہدی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسے خلیفۃ اللہ کہا ہے اور اس کی مدد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بنو عباس کو تقدیر کی طرف سے خلافت دیئے جانے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اور اس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کی گنجائش نہ تھی۔ اس سے دراصل یہ بتانا مطلوب تھا کہ اور لوگوں کی طرح جنہوں نے خلافت حاصل کرنے کی کوششیں کیں اور ناکام رہے اور سوائے شور اور گڑبڑ کے ہاتھ کچھ نہ آیا، بنو عباس ناکام نہ رہیں گے۔ چنانچہ بنو عباس کا مہدی اس لیے خلیفۃ اللہ ہے کہ تقدیر الٰہی میں عباسیوں کے لیے خلافت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور یہ فیصلہ کسی طرح رد نہیں کیا جا سکتا۔ بات یہ ہے کہ شریعت میں سب سے اہم چیز تو یہ ہے کہ تنازع نہ رہے۔ ملک میں گڑبڑ کا خاتمہ ہو جائے اور خلافت کا کام استحکام پا جائے۔ اس لیے مستحکم خلافت خواہ اس کی مسند پر بیٹھنے والا زوال پذیر خلافت کے صاحب اختیار سے کمتر ہو انتشار اور گڑبڑ سے ہر حال میں بہتر ہے۔[1]

میرے نزدیک (از مولانا سندھی) اگر اس مہدی کا آنا جو آخری زمانے میں ظاہر ہوگا احادیث

سے صحیح ثابت ہو بھی جائے تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ وہ مہدی اس وقت آئے گا جب قیامت کی گھڑی قریب آجائے گی۔ اس وقت نہ تو شریعت کے عمل دخل کا امکان رہے گا۔ اور نہ قانون کے نافذ ہونے کی فرصت۔ اس لیے مہدی کے آنے پر مسلمانوں کی فلاح کو معلق رکھنا کسی طرح ٹھیک نہیں ہے۔ بے شک وہ حدیثیں جو مہدی کے آنے کے متعلق امام ولی اللہ نے بیان کی ہیں، وہ علم حدیث کی تیسرے درجہ کی کتابوں میں مروی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہم ان روایتوں کو قبول کرتے ہیں کیونکہ ان کی اصل عبارت نزدیک ثابت ہے۔ امام ابو داؤد ہلال بن عمرو سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا کہ میں نے علیؓ کو یہ کہتے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماوراء النہر سے ایک آدمی ظاہر ہوگا۔ جسے حارث کہا جاتا ہوگا اس کے آگے آگے ایک اور آدمی ہوگا، جس کا نام منصور ہوگا، یہ میرے اس قول کو عملی جامہ پہنانے کے لیے زمین ہموار کرے گا۔ جس طرح قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نفاذ عمل کا ذریعہ تھے۔ اس وقت ہر مومن کا فرض ہوگا کہ اس کی مدد کرے۔ راوی کا بیان ہے کہ رسول اللہ نے شاید یہ کہا ہو کہ اس وقت ہر مومن کا فرض ہوگا کہ اس کی پکار پر لبیک کہے۔

میرے نزدیک (از مولانا سندھی) یہ ساری کی ساری حدیثیں عباسیوں کے مہدی کی طرف بالصراحت اشارہ کرتی ہیں، جیسا کہ امام ولی اللہ نے بیان فرمایا ہے۔ نیز ان حدیثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل بیت سے یہاں سارے کے سارے بنو ہاشم مراد ہیں۔ حدیث کے یہ الفاظ کہ یہ مہدی زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سنت پر عمل کرے گا۔ اور عدل و انصاف کے متعلق اسلام کے جو قاعدے اور ضابطے ہیں، خود ان کا پابند رہے گا، جیسا کہ بنو امیہ میں عمر بن عبدالعزیز تھے۔ السیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ سفیان ثوری فرمایا کرتے تھے کہ عباسیوں کا مہدی عمر بن عبدالعزیز کا مثیل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ مہدی ان ظالم فرمانرواؤں کی طرح نہ ہوگا، جو اپنے آپ کو قوانین اور ضابطوں سے مستثنیٰ قرار دے لیتے ہیں۔ میرے نزدیک یہی عباسی مہدی ان حدیثوں کا مصداق ہے، جن میں اہل بیت میں سے ایک آدمی کے ظاہر ہونے کا

اشارہ کیا گیا ہے۔

اسی سلسلے کی ایک حدیث اور ہے جس کو ابوداؤد نے عاصم سے اور عاصم نے زر سے اور انہوں نے عبداللہ بن مسعود سے بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر دنیا کی عمر ایک دن کی بھی رہ گئی تو اللہ تعالیٰ اس ایک دن کو بھی اتنا لمبا کر دے گا کہ ایک آدمی میرے اہل بیت سے ظاہر ہو۔ اس کا نام میرے نام کا سا ہوگا اور اس کے باپ کا نام بھی میرے باپ کے نام کا سا ہوگا۔ اور وہ ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے گا۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ مہدی عباسی کا نام محمد بن عبداللہ تھا۔ نیز وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت یعنی بنو ہاشم میں سے تھا۔ چنانچہ امام ولی اللہ کا اشارہ اسی مہدی کی طرف ہے اور یہی وہ مہدی ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ آخری زمانے میں ظاہر ہوگا۔

عام طور پر مشہور یہ ہے کہ مہدی حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی اولاد میں سے ہوگا۔ چنانچہ بعد کے زمانے میں اصحاب کشف نے اس بات پر بہت زور دیا۔ جب بغداد تباہ ہو گیا اور عباسی خلافت کا نام و نشان مٹ گیا تو مہدی کے اولادِ فاطمہؓ میں سے ہونے پر اور اصرار ہونے لگا۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ جن حدیثوں میں مہدی کے فاطمی النسب ہونے کا ذکر آیا ہے، وہ اسناد کے اعتبار سے ضعیف قرار دی گئی ہیں۔ میرے خیال میں ابوداؤد کا یہ رجحان تھا کہ بارہ اماموں میں سے ایک کو مہدی قرار دیں۔ اسی غرض سے موصوف نے مہدی کے باب میں یہ حدیث روایت کی ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایسی روایتیں بھی بیان کی ہیں، جن سے عبداللہ بن زبیر کی خلافت اور لشکر کے دھنس جانے کے قصے کی طرف اشارہ ہے۔ نیز امام مالک عبداللہ بن زبیر کو ائمہ میں سے شمار کرتے تھے اور ان کے مقابلے میں عبدالملک بن مروان کی خلافت کو جائز نہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ اس باب میں سب سے پہلے وہ حدیث بیان کرتے ہیں، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مہدی اہل بیت میں سے ہوگا۔ یہاں وہ اہل بیت کی صراحت نہیں کرتے۔ اس کے بعد جو حدیثیں درج کرتے ہیں، ان میں مذکور ہے کہ یہ مہدی اولادِ فاطمہؓ اور اولادِ حسنؓ میں سے ہوگا۔ لیکن اس باب کے آخر میں جو حدیثیں مروی ہیں،

ان کا مصداق وہ مہدی ہے جو منصور کا بیٹا تھا اور وہ خاندان عباسی کا تیسرا خلیفہ ہے۔ غرضیکہ احادیث کو اس ترتیب سے ذکر کرنے سے ان کا مقصد دراصل یہ ہے کہ قارئین یہ جان لیں کہ مرجح قول آخر ہی ہے۔

شیخ ابو الطیب شمس الحق اپنی کتاب "عون المعبود" میں لکھتے ہیں "شیعہ اور ان میں بھی خاص طور پر امامیہ فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امام حق حضرت علیؓ ہیں ان کے بعد حسنؓ پھر حسینؓ، پھر زین العابدینؒ، پھر محمد باقرؒ، پھر جعفر صادقؒ، پھر موسیٰ کاظمؒ، پھر علی رضاؒ پھر محمد تقیؒ، پھر علی نقیؒ، پھر حسن عسکریؒ ہیں۔ حسن عسکری کے بیٹے مہدی ہیں جن کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ مہدی منتظر اپنے دشمنوں کے خوف سے روپوش ہو گئے ہیں۔ ایک دن آئے گا کہ یہ ظاہر ہوں گے اور ظلم و جور سے بھری ہوئی زمین کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ ان لوگوں کے نزدیک عمر کا اتنا لمبا ہونا اور زندگی کا اس قدر استداد کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔"

میرے (از مولانا اسعدی) خیال میں اہل سنت اور شیعہ کے درمیان اصل نزاع حسب ذیل ہے۔ قرآن مجید نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور اس نے بشارت دی کہ قرآن کا دین سب دینوں پر غالب ہو کر رہے گا۔ اب ہوا یہ کہ اکثر ممالک خلفاء راشدین کے عہد میں مفتوح ہوئے اور ان کے بعد بنو امیہ، بنو عباس اور ہندوستان کے بادشاہوں نے اسلامی سلطنت کی سرحدوں کو وسیع کیا۔ لیکن شیعہ فرقہ ان میں سے کسی کی سلطنت کو بھی جائز نہیں سمجھتے۔ اس لئے ان کے نزدیک قرآن کا یہ وعدہ کہ اس کا دین سب دینوں پر غالب ہو کر رہے گا، ہنوز پورا نہیں ہوا۔ ان کے عقیدے میں یہ وعدہ صرف اولاد فاطمہؓ میں سے ہی کسی امام کے ہاتھ سے عمل جامہ پہن سکتا ہے۔ الغرض یہ اساس ہے جس پر ان کے اس مہدی کے آنے کے عقیدے کی عمارت بنی۔

باقی رہا اہل سنت کا معاملہ سو ان کے نزدیک تو قرآن کا یہ وعدہ مہاجرین اور انصار کے ہاتھوں پورا ہو چکا۔ وہ حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کو بھی ان مہاجرین اور انصار کی جماعت میں شامل سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بات یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی حدیثوں میں فرمایا ہے

کہ میری امت میں جھوٹے دجّال ہوں گے۔ اور یہ بھی خبر دی ہے کہ ایسے ائمہ بھی پیدا ہوں گے۔ جو اصحاب رُشد ہوں گے، اور مہدی ہوں گے۔ کذّابوں اور باطل پرستوں نے دین میں جو فساد بپا کر رکھا ہوگا، وہ اس کی اصلاح کریں گے۔ نیز یہ بتایا گیا ہے کہ یہ ائمہ جیسے کہ قریش کے اور قبیلوں میں سے ہوں گے ایسے بنو ہاشم میں سے بھی ہوں گے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ نفاق میں غلو رکھنے والے امامت اور مہدیت کو نبوت کا درجہ دیتے ہیں۔ اور اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اور انبیاء کا آنا مانتے ہیں۔ سو تم عقل سے کام لو اور بے سوچے سمجھے ورق گردانی میں نہ پڑو۔

امام ولی اللہ "فیوض الحرمین" میں لکھتے ہیں: "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شیعوں کے بارے میں ایک روحانی سوال پوچھا تو مجھے یہ القا کیا گیا: اُن کا مذہب جھوٹا ہے اور اُن کے مذہب کے جھوٹے ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ امام کو مانتے ہیں۔ بعد ازاں جب میں اس کیفیت و جذب سے نکلا تو سمجھا کہ ان کے ہاں چونکہ امام معصوم ہوتا ہے، اور اس امام کی اطاعت فرض ہے اور وہ مانتے ہیں کہ اسے باطن میں وحی بھی ہوتی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مطلب یہ نکلا کہ امام ماننے سے ختم نبوت کا انکار لازم آتا ہے۔"

## مسلک: چار بنیادی اخلاق:

امام ولی اللہ "ہمعات" میں لکھتے ہیں۔ اس فقیر پر یہ بات روشن کی گئی ہے کہ تہذیب نفس کے سلسلے میں جو چیز شریعت میں مطلوب ہے، وہ چار خصلتیں ہیں۔ حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو انہی چار خصلتوں کو قائم کرنے کے لیے بھیجا۔ تمام اہل حق نے انہی چار خصلتوں کا ارشاد اور ان کے حاصل کرنے کی ترغیب و تحریص کی ہے، یعنی نیکی ان چار خصلتوں کا حاصل ہے اور گناہ سے مراد وہ عقائد و اعمال و اخلاق ہیں جو انہیں چار خصلتوں کی ضد ہیں۔

ان چار خصلتوں میں سے ایک طہارت ہے۔ اس کی حقیقت کی طرف میلان ہر سلیم الفطرت انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ لیکن یہ گمان نہ کر لینا کہ یہاں طہارت سے مراد وضو اور غسل

ہے۔ طہارت کا اصل مقصود وضو اور غسل کی مدد سے اور اُن کا نور ہے۔ جب آدمی نجاستوں میں آلودہ ہو۔ میل کچیل اور بال اس کے بدن پر جمع ہوں۔ اور بول و براز اور ریح سے اس کے معدہ میں گرانی پیدا کی ہو تو ضروری اور لازمی بات ہے کہ وہ انقباض، تنگی اور حزن اپنے اندر پائے گا۔ جب وہ غسل کرے گا۔ زائد بالوں کو دور کرے گا۔ نیا لباس زیب تن کرے گا اور خوشبو لگائے گا تو اسے اپنے نفس میں انشراح، سرور اور انبساط کا احساس ہوگا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ طہارت ایک وجدانی کیفیت ہے۔ جو اُنس اور نور سے تعبیر کی جاتی ہے۔

دوسری خصلت خدا تعالیٰ کے لیے خضوع یعنی نہایت درجہ کی عجز و نیازمندی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک سلیم الفطرت شخص جب طبعی اور خارجی تشویش سے فراغت کے بعد اللہ تعالیٰ کی صفات اُس کے جلال اور اُس کی کبریائی پر غور کرتا ہے تو اس پر حیرت اور دہشت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہی حیرت اور دہشت خشوع، خضوع، اخبات یعنی نیازمندی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک سوچنے والا انسان جب کائنات کی اس گتھی کو حل کرنے سے عاجز آ جاتا ہے اور اس عجز اور افتادگی کی حالت میں کسی بالاتر قوت کے سامنے اپنے آپ کو بے دست و پا پاتا ہے تو اس کی یہ بے دست و پائی اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے سے بالاتر کسی اور قوت کو مانے۔ جب نفس اس کیفیت سے رنگین ہو جاتا ہے اور یہ خصلت اس کے اصل جوہر میں داخل ہو جاتی ہے تو اس شخص اور ملاءِ اعلیٰ کے مابین ایک دروازہ کھل جاتا ہے۔ اس سے اس شخص پر وہ معارفِ جلیلہ منکشف ہوتے ہیں جن کا قالب تجلیاتِ الٰہیہ ہیں۔

تیسری خصلت سماحت اور فیاضی ہے اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ نفس طلب لذت، حب انتقام، بخل اور حرص وغیرہ سے مغلوب نہ ہو۔ اس ذیل میں عفت، جد و جہد، صبر، عفو، سماحت، قناعت اور تقویٰ آ جاتے ہیں۔ شکم اور فرج کی خواہش کو قبول نہ کرنے کا نام عفت ہے۔ آسائش اور ترکِ عمل کی خواہش کو قبول نہ کرنے کا نام جد و جہد ہے۔ جزع اور فزع کو روکنا صبر ہے۔ انتقام کی

خواہش کو دبا دینا عفت، خواہش بخل کو چھوڑ دینے کا نام سخاوت اور حرص کو قبول نہ کرنا قناعت ہے، شریعت کی بنائی ہوئی حدود سے تجاوز نہ کرنا تقویٰ ہے۔

چوتھی خصلت عدالت ہے۔ سیاسی اور اجتماعی نظاموں کی روح رواں یہی خصلت ہے ادب، کفایت، حریت، سیاست مدنیہ اور حسن معاشرت وغیرہ سب عدالت کی شاخیں ہیں۔ اپنی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھنا، عمدہ اور بہتر وضع اختیار کرنا اور دل کو ہمیشہ اس طرف متوجہ رکھنا ادب ہے۔ جمع و خرچ، خرید و فروخت اور تمام معاملات میں عقل و تدبیر سے کام لینا کفایت ہے۔ خانہ داری کے کاموں کو خوبی سے انجام دینا حریت ہے۔ شہروں اور لشکروں کا اچھا انتظام کرنا سیاست مدنیہ ہے۔ بھائیوں میں نیک زندگی بسر کرنا، ہر ایک کے حق کو سمجھنا اور اُن سے الفت اور محبت سے پیش آنا حسن معاشرت ہے۔ الغرض یہ ایک طویل بحث ہے۔ اگر تفصیل درکار ہو تو حجۃ اللہ البالغہ میں دیکھئے۔

## ۱۵۔ کسریٰ و قیصر کا نظام:

امام ولی اللہ رحمۃ اللہ کے مقدمہ ۳۳ میں فرماتے ہیں جب ایرانیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں، دنیوی آسائش کو انہوں نے اپنی زندگی بنا لیا، آخرت کو بھلا دیا اور شیطان نے ان پر غلبہ کر لیا تو اب ان کی تمام زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہوگئے اور ان میں ہر شخص سرمایہ داری اور تمول پر فخر کرنے اور اترانے لگا۔ یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سے وہاں ایسے ماہرین جمع ہو گئے جو عیش پسندوں کے لیے عیش پسندی کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامان عیش مہیا کرنے کی غرض سے عجیب و غریب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے۔ قوم کے اکابر اس جد و جہد میں مشغول نظر آنے لگے کہ اسباب تعیش میں کس طرح وہ دوسروں پر فائق ہو سکتے اور ایک دوسرے پر فخر و مباہات کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے امراء اور سرمایہ داروں کے لیے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ ان

کی کمر کا پٹکہ یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو۔ یا ان کے پاس عالی شان سر بفلک محل نہ ہوں جس میں پانی کے حوض سرد و گرم حمام، بے نظیر باغیچے، باغ ہوں اور فرورت سے زائد نمائش کے لیے بیش قیمت سواریاں، حشم و خدم اور حسین و جمیل باندیاں موجود ہوں، صبح و شام رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں، جام و سبو سے شراب ارغوانی چھلک رہی ہو۔ اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو اور جس کا ذکر قصہ طولانی کے مرادف ہے۔

غرض یہ غلط اور گمراہ کن عیش ان کے معاشی نظام کا اصل الاصول بن گیا تھا اور کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ یہ صرف نواب اور امراء کے طبقہ ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ پوری مملکت میں ایک عظیم الشان آفت اور وبا کی طرح سرایت کر گیا تھا۔ عوام و خواص سب میں یہی جذبہ کار فرما پایا جاتا تھا اور یہ ان کے معاشی نظام کی تباہی کا باعث بن رہا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت پر یہ حالت طاری تھی کہ دلوں کا امن و سکون مٹ گیا تھا۔ ناامیدی کاہلی بڑھتی جاتی تھی اور بہت بڑی اکثریت رنج و غم اور آلام و مصائب میں گھری نظر آتی تھی۔ اس لیے کہ مفروضہ عیش پرستی کے لیے زیادہ سے زیادہ رقوم اور آمدنی درکار تھی اور وہ ہر شخص کو میسر نہ تھی۔ اس کے لیے بادشاہ، نواب، امراء اور حکام نے معاشی دست برد شروع کر دی۔ اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کاشتکاروں، تاجروں، پیشہ وروں اور اسی طرح دوسرے کاروباریوں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کر کے ان کی کمر توڑ دی۔ انکار کرنے پر ان کو سخت سے سخت سزائیں دیں اور مجبور کر کے ان کو ایسے گھوڑوں اور گدھوں کی طرح بنا دیا جو آبپاشی اور ہل چلانے کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ پھر کاریگروں اور مزدور پیشہ لوگوں کو اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ اپنی حاجات و ضروریات کے مطابق بھی کچھ پیدا کر سکیں۔

خلاصہ یہ کہ ظلم و بد اخلاقی کی انتہا ہو گئی تھی۔ اس پریشان حالی اور افلاس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو اپنی اخروی سعادت و فلاح اور خدا سے رشتۂ بندگی جوڑنے کے لیے بھی مہلت نہ ملتی تھی۔ اس فاسد معاشی نظام کا ایک مکروہ پہلو یہ بھی تھا کہ جن صنفوں پر نظام عالم کی بنیاد قائم ہے،

وہ اکثر یک قلم متروک ہو گئیں اور امراء و رؤساء کی رضیات و خواہشات کی تکمیل ہی سب سے بڑی خدمت اور سب سے بہتر ہنر شمار ہونے لگا۔ جمہور کی یہ حالت تھی کہ ان کی تمام زندگی بد اخلاقیوں کا نمونہ بن گئی تھی اور ان میں سے اکثر کا گزارہ بادشاہوں کے خزانوں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہو گیا تھا۔ مثلاً ایک طبقہ جہاد کیے بغیر اپنے دادا کے نام پر یا ہنر کے نام سے وظیفہ خوار کر رہا ہے تو دوسرا تدبیر مملکت کے نام سے پل رہا ہے۔ کوئی بادشاہ و امراء کی خوشامد میں قصیدہ خوانی کر کے شاعری کے نام سے وثیقہ پا رہا ہے، تو کوئی صوفی اور فقیر بن کر دعا گوئی کے ذریعہ مالی استحصال کر رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ کسب معاش کے بہترین طریقوں کا فقدان تھا اور ایک بڑی جماعت چاپلوسی، مصاحبت، چرب زبانی اور دربار داری کے ذریعہ معاش حاصل کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ یہ ایک ایسا فن بن گیا تھا جس نے ان کے افکار عالیہ اور ذہنی نشوونما کی تمام خوبیاں مٹا کر پست اور ارذل زندگی پر قانع کر دیا تھا۔

پس جب یہ فاسد مادہ وبا کی طرح پھیل گیا اور لوگوں کے دلوں تک سرایت کر گیا تو ان کے نفوس ذہانت و نجابت سے بھر گئے۔ ان کے طبائع اخلاق صالحہ سے نفرت کرنے لگے۔ ان کے تمام اخلاق کریمانہ کو گھن لگ گیا۔ یہ سب اس فاسد معاشی نظام کی بدولت پیش آیا جو عجم و روم کی حکومتوں میں کارفرما تھا۔ آخر جب اس مصیبت نے ایک عجیب شکل اختیار کر لی اور مرض ناقابل علاج حد تک پہنچ گیا تو خدا تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھا اور اس کی غیرت نے تقاضا کیا کہ اس مہلک مرض کا ایسا علاج کیا جائے کہ فاسد مادہ جڑ سے کٹ جائے اور اس کا قلع قمع ہو جائے۔ اس نے ایک "نبی امی" (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث کیا اور اسے اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا۔ وہ آیا اور اس نے روم و فارس کی ان تمام رسوم کو فنا کر دیا اور عجم و روم کے رسم و رواج کے خلاف صحیح اصولوں پر ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔

اس نظام میں فارس و روم کے فاسد نظام کی قباحت کو اس طرح ظاہر کیا کہ معاشی زندگی کے ان تمام اسباب کو یک قلم حرام قرار دیا جو عوام اور جمہور پر معاشی وسعت برد کا سبب بنتے اور

تکلفات عیش پسندیوں کی راہیں کھول کر عیاشی و خرچی میں بے جا انہماک کا باعث ہوتے ہیں۔
مثلاً مردوں کے لیے سونے چاندی کے زیورات اور ریشم و دیبا کے نازک کپڑوں کا استعمال،
تمام اہل نفوس کے لیے خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہر قسم کے چاندی اور سونے کے برتنوں کا استعمال،
عالی شان کوٹھیوں اور رفیع الشان محلات و قصور کی تعمیر اور مکانوں میں فضول زیبائش وغیرہ کہ یہی
تمدنی نظام کے ابتدائی منازل اور معاشی نظام کی تباہی کا مولد ہیں۔ (اردو ترجمہ از مولانا [illegible]
[illegible] "[illegible] البالغہ" ہمیں)...... اور اسی کے قائم کردہ نظام نے قیصر و کسریٰ کی دولت
باطل کر دیا۔ چنانچہ آپ کا یہ ارشاد صحیح ثابت ہوا کہ کسریٰ ہلاک ہو گا اور پھر اس کا نام و نشان نظر
نہ آئے گا اور قیصر کی ہلاکت کے بعد اس کا نام لیوا کوئی نہ ہو گا

## شاہ امام عبد العزیز کا خواب:

"ملفوظات عزیزیہ" میں ہے۔ فقیر نے خواب میں دیکھا کہ ایک میدان ہے جس میں سفید براق
فرش بچھا ہے۔ اس فرش پر بہت سے آدمی بیٹھے ہیں جن کی شکلیں نورانی اور لباس فاخرہ ہیں
اور جناب امیر (علی کرم اللہ وجہہ) کا انتظار کر رہے ہیں۔ فقیر بھی اسی غرض سے فرش پر بیٹھ گیا۔
ناگاہ دیکھتا ہوں کہ جناب امیر قبلہ کی طرف سے نمودار ہوئے اور ہماری طرف تشریف لائے۔
آپ کو دیکھ کر سب لوگ تعظیماً کھڑے ہو گئے اور فرش کے کنارے کی طرف آپ کی پیشوائی کے
لیے آگے بڑھے۔ فقیر بھی اٹھ کھڑا ہوا اور چونکہ عظمت اشخاص کا لحاظ اچھی طرح تھا اس لیے میں
فرش کے کنارے پر آپ کی پیشوائی کے لیے نہ پہنچ سکا۔ میں فرش کے وسط میں کھڑا تھا۔ جناب
امیر تشریف لاتے۔ صفوں کو چیرتے ہوئے میرے پاس پہنچ گئے اور فرش پر چار زانو بیٹھ گئے۔
میں متادب ہو کر آپ کے مقابل دو زانو بیٹھا۔ آپ نے مجھ پر بہت شفقت فرمائی اور ملاطفت بھی
اسی طور سے ظاہر کی۔ فقیر نے اس وقت کو غنیمت جانا اور چند ایک چیزیں جو ذہن میں تھیں،
وہ جناب امیر کی خدمت میں عرض کیں اور آپ نے جواب باصواب ارشاد فرمایا۔

سب سے پہلے آپ نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے سنا ہے کہ کسی شخص نے پشتو میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے میری تکفیر نکلتی ہے۔ تمہیں اس کی خبر ہے یا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ بندہ پشتو زبان نہیں جانتا اس لیے اس کتاب سے واقف نہیں خدا نے چاہا تو آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اس امر کی تحقیق کروں گا۔

اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ مذاہب فقہ میں سے کون سا مذہب جنابؓ کو پسند ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے کوئی مذہب بھی پسند نہیں یا آپ نے یہ فرمایا کہ ان میں کوئی بھی ہمارا مختار نہیں کیونکہ ہر مذہب افراط و تفریط میں پڑ گیا ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ تصوف کے طریقوں میں سے کون سا طریقہ جنابؓ کو پسند ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس مسئلہ میں بھی میرا پہلا سا جواب ہے۔ کیونکہ یہاں بھی اچھی چیزوں کے ساتھ بری چیزیں ملا دی گئی ہیں۔ اس لیے ہمارے خیال میں ان میں خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں لیکن جہاں تک اصل طریقہ کا تعلق ہے ہمارے زمانے میں تقریباً ان سب کا عمل انہی چیزوں پر ہے اور یہی بری چیزیں عام طور پر رائج ہیں۔ کچھ دیر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر گفتگو کے بعد آپ یکایک اٹھ کھڑے ہوئے اور جس سمت سے تشریف لائے تھے اسی طرف تشریف لے گئے اور لوگ جو ان کے انتظار میں تھے حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔

"مقامات" میں (جو مولانا مندوی کی غیر مطبوعہ کتاب ہے) ہے کہ رجب ۱۲۰۸ھ یا ۱۲۰۹ھ میں شاہ عبدالعزیز نے امیر المومنین علی بن ابی طالب امام انقلاب کو خواب میں دیکھا۔ آپ نے شاہ عبدالعزیز کو [illegible] اور اس میں اصلاح کرنے کے طریقوں کی طرف رہنمائی کی چنانچہ موصوف نے جناب امیرؓ کے ارشاد کی تعمیل کی اور اپنی کوششوں سے عام مسلمانوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ شاہ صاحب کے اصحاب عام مسلمانوں کی اعانت سے حکومت مؤقتہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

اس خواب کے ضمن میں سیرت سید احمد شہید صفحہ ۸۹ میں مذکور ہے کہ [illegible] شاہ صاحب [illegible] سب سے پہلے حضرت شاہ غلام علی مجددی دہلوی متوفی ۱۲۴۰ھ کی خدمت میں تشریف لے گئے۔

موصوف حضرت مرزا جانجاناں مظہر کے خلیفہ تھے۔ شاہ صاحب نے ان سے خواب کی تعبیر چاہی تو
شاہ غلام علی نے فرمایا۔ میری سمجھ میں آتا ہے کہ سید حسن رسول نما کی وفات کے بعد رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کی توجہ ان دیار میں ہدایت خلق کی طرف بہت کم ہو گئی ہے۔ اس خواب سے معلوم
ہوتا ہے کہ اب آپ کے یا آپ کے کسی مرید رشید کے ذریعہ وہ سلسلہ پھر شروع ہو جائے گا۔
شاہ صاحب نے فرمایا میرے خیال میں بھی یہ تعبیر آئی تھی۔

مولانا نور الحق صاحب (مرتب کتاب ہذا) لکھتے ہیں۔ مولانا شیخ محمد فیضی نے مجھ سے ۲۶
جون ۱۹۵۹ء کو فرمایا کہ یہ خواب شاہ عبدالعزیز کی عظمت پر دال ہے کہ ان کے عہد میں رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم کی روحانی توجہ آپ کے ملک پر تھی۔ اور یہ فقرہ "یا آپ کے کسی مرید رشید کے ذریعہ"
میرا خیال ہے کہ یہ فقرہ شاہ غلام علی کے ذمہ لگا کر محض اس لیے بڑھا دیا گیا کہ سید احمد شہید کی
فضیلت ثابت کی جا سکے ورنہ اصل خواب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(فائدہ) سید حسن رسول نما کا تذکرہ مختصراً خزینۃ الاصفیاء صفحہ ۱۰ میں موجود ہے۔ آپ کی
وفات ۱۱۰۳ھ میں ہوئی۔ امام ولی اللہ تفہیمات صفحہ ۲۴ (خطبہ) میں لکھتے ہیں۔ میرے والد کے
پیر و مرشدوں میں سے ایک خواجہ محمد بہار گنج کے قریب رہتے تھے۔ انہیں سید حسن رسول نما کی صحبت
نصیب ہوئی تھی۔ موصوف لکھتے ہیں کہ ایک روز سید حسن رسول نما قوالی سن رہے تھے۔ اس میں
ایسے شعر گائے جا رہے تھے جن میں آپ کو سگ محبوب سے تشبیہ دی گئی ہے۔ آپ اس
تشبیہ سے برابر محظوظ ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ذوق اور لذت کی یہ کیفیت بڑھتی چلی جاتی اور
طبیعت اس کیفیت پر نہ جم سکی۔ آپ نے یہ کیا کہ ایک طرف تشریف لے گئے۔ اپنے گلے میں رسی
ڈالی۔ اس کو میخ سے مضبوط باندھ دیا اور اپنے اوپر جھول ڈالی۔ پھر یہ شعر پڑھنا شروع کیا اور
اس میخ کے اردگرد گھومنے لگے۔ اس طرح کرنے سے آپ پر لذت کی جو یہ کیفیت طاری ہو
گئی اور اس سے طبیعت کو ثبات نصیب ہوا۔

سے صوبہ کابل کا خزانہ نکلتا تھا، ان کو بھی اپنے قبضہ میں کیا۔ چنانچہ ماہ صفر ۱۱۵۲ھ کو نادر شاہ جہاں آباد سے روانہ ہوا۔ (سیر المتاخرین)

## شاہ میر اویس:

۱۱۱۸ھ میں افغانوں کی قومی حکومت میر اویس سے شروع ہوتی ہے۔ میر اویس قندھار کا حاکم تھا۔ اس نے ایران پر حملہ کیا اور یہ سلسلہ اس قدر بڑھا کہ ایران میں افغان حکومت قائم ہو گئی جس کے رد عمل میں نادر شاہ کا ظہور ہوا۔ میر اویس کی حکومت ایران کی دشمن تھی مگر اس کا تعلق محمد شاہ کی حکومت سے دوستانہ تھا۔ چنانچہ محمد شاہ بھی اس کی سرپرستی کرتا تھا۔ اور اصل میں میر اویس بھی محمد شاہ کا فرمانبردار دوست تھا۔ اس بنا پر سیر المتاخرین کے مصنف کو جو خود شیعہ اور ایرانی شیعہ حکومت کا طرفدار ہے، یہ لکھنا پڑا۔

وہ لکھتا ہے: عجیب بات ہے کہ ایران کے صفوی سلاطین نے کسی معاملے میں کبھی سلاطین ہند سے مدد نہیں چاہی لیکن اس کے باوجود شاہان صفویہ خصوصاً شاہ اسماعیل صفوی اور شاہ طہماسپ نے بابر اور اس کے بیٹے ہمایوں سے جو مہربانیاں اور التفات برتا، وہ ظاہر و آشکارا ہے۔ گو صفوی بادشاہوں کی ہندوستان کے متعلق فرمانرواؤں سے کوئی غرض وابستہ نہیں تھی لیکن پھر بھی وہ ان کی طرف سفیر بھیجتے رہتے اور تہنیت و تعزیت کے پیغامات کا سلسلہ ان کے ساتھ جاری رکھتے، لیکن سلاطین ہند نے ان کی اس مہر و محبت اور وفاداری کا پاس نہ کیا۔ ایران میں فتنہ و فساد برپا ہوا۔ آخر میں شاہ طہماسپ ثانی اپنے آباؤ اجداد کے تخت پر قبضہ کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا اور حملہ آور افغان ایران سے نکل بھاگ گئے۔ لیکن محمد شاہ نے اس معاملے میں بالکل خاموشی اختیار کی اور طہماسپ ثانی کو کوئی تہنیت کا پیغام نہ بھیجا۔ اس کے خلاف اس نے یہ کیا کہ میر ویس افغانی سے اتحاد و دوستی کا رشتہ قائم رکھا۔ اور تو اور میر اویس کے بیٹے حسین سے بھی جو آخر میں قندھار کا حاکم تھا اور لشکر لے کر خراسان تک چڑھ آیا تھا اور ان نواح میں اس نے بڑی قتل و غارت اور لوٹ مار کی تھی، کوئی پرسش نہ کی اور اس سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رکھا۔

واضح رہے کہ مغربی افغانوں نے ایران پر حملہ کیا۔ ان کا سردار محمود خاں تھا اس نے ۱۱۳۴ھ
میں اصفہان کو فتح کر لیا۔ حسین شاہ صفوی شاہ ایران کو قید کر لیا اور دار الخلافہ پر قبضہ کر کے وہ
خود بادشاہ ہو گیا۔ تین برس سلطنت کر کے ۱۱۳۷ھ میں مر گیا۔ بعد ازاں اس کا رشتہ دار اشرف جانشین
ہوا۔ شاہ ایران تو افغانوں کی قید میں تھا مگر شہزادہ طہماسپ وہاں سے نکل کر شمال مغربی خطے
میں چلا گیا جواب تک افغانوں نے فتح نہیں کئے تھے، بادشاہ بن گیا۔ ۱۱۳۷ھ میں قسمت سے اس کو ایک لائق
اور مستقل مزاج آدمی مل گیا اور وہ نادر شاہ تھا۔ اس کا اصل نام نادر قلی خان پسر امام قلی خاں۔ قوم
اس کی افشار تھی۔ وہ کچھ رتبہ کا آدمی نہ تھا۔ بعض اس کو پوستین دوز بتاتے تھے۔ نادر کے لڑکے کی
شادی جب محمد شاہ کی بیٹی سے ہونی تھی اور دلہن والوں کے دستور کے مطابق دولہا سے اپنی سات
پشت تک نام پوچھے تو نادر نے کہا: بگو و ا ادر شاہ پسر نادر شاہ است و نادر پسر شمشیر تا ہم چنیں تا ہفتاد
بار شمار۔ محمد شاہ ۱۱۰۰ھ میں پیدا ہوا۔ اس کی شجاعت و جلالت و حکمت کے کارنامے دیکھ کر عقل دنگ
ہوتی ہے۔ وہ ملک کے ملک اور صوبے کے صوبے فتح کرتا چلا گیا۔ سب سے عظیم الشان کام اس کا
یہ تھا کہ اس نے ایران کو ۱۱۴۳ھ میں بالکل پٹھانوں سے پاک صاف کر دیا تھا۔ اس کے عوض بادشاہ
نے خراسان، مازندران، سیستان، کرمان اس کو بخش دیئے۔ اس نے ۱۱۴۸ھ میں ایران کی سلطنت کو
اتنی وسعت دی کہ اس کی حدود اپنی قدیمی صورت پر قائم ہو گئیں۔ ۱۱۴۸ھ میں خاندان صفویہ کا خاتمہ
ہوا۔ اب وہ مستقل بادشاہ بن گیا اور ۱۱۵۱ھ میں ہندوستان پر آندھی کی طرح چڑھ آیا۔ (تاریخ ذکاء اللہ
ص ۳۲۴)

## (۵) احمد شاہ ابدالی:

۱۱۶۰ھ میں نادر شاہ اپنے ملازموں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ احمد خاں درانی پہلے نادر شاہ
کے ہاں پیادہ تھا۔ پھر رفتہ رفتہ بڑا افسر بن گیا۔ جب نادر مر گیا تو خود مختار اور قندھار پر قابض
ہو گیا اور وہاں اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کرایا۔ نادر شاہ کے زمانے سے ناصر خاں صوبہ دار کابل

تھا۔ احمد خان ابدالی نے بھی اس کو بدستور اپنے عہدے پر قائم رکھا، مگر پانچسو سوار دُرّانی اس کے ساتھ کئے تاکہ پانچ لاکھ روپیہ جس کے دینے کا اس نے وعدہ کیا تھا، فوراً بھیج دے۔ ناصر خان کابل پہنچ کر وعدے سے پھر گیا۔ احمد شاہ ابدالی نے اس پر لشکر کشی کی وہ بھاگ کر پشاور پہنچا۔ جب احمد شاہ ابدالی اس طرح سرحد پر آیا تو اس نے سرحد اور پنجاب کا بُرا حال دیکھا۔ اس پر وہ لاہور کی طرف بڑھا۔ جب محمد شاہ کو خبر ہوئی تو اس نے دہلی سے ایک فوج جرار روانہ کی۔

احمد شاہ ابدالی لاہور پر قابض ہو کر ستلج کے کنارے پہنچا۔ اس کے پاس بارہ ہزار سے زیادہ فوج نہ تھی کیونکہ وہ فوج کی کثرت کے بجائے اس کی طاقت و قوت پر اعتماد رکھتا تھا۔ ۳ ربیع الاول ۱۱۶۱ھ کو اس نے سرہند پر قبضہ کر لیا اور آگے بڑھا۔ ستلج کے کنارے ۱۵ ربیع الاول سے ۲۸ ربیع الاول تک دونوں فوجوں میں سخت جنگ ہوئی۔ اسی اثناء میں ضعیف خواجہ سرا نے جو بادشاہ کے سر پر چڑھا ہوا تھا شاہ درانی کو صلح کا پیغام دیا۔ بادشاہ محمد شاہ نادر گردی دیکھے ہوئے تھے، اس نے ملتان اور لاہور ہر دو صوبے دے کر صلح کر لی اور غنیمت جانا کہ بلا ٹلی۔ احمد شاہ ہر دو صوبے معین الملک پسر قمرالدین خان کو دے کر واپس چلا گیا۔ پھر ۱۱۷۰ھ کو دوبارہ دہلی آیا اور دہلی کو اس طرح لوٹا کہ نادر گردی کو بھی مات کر دیا۔ وہ خود تو نادر کی طرح سفاک و بے رحم نہ تھا، مگر اس کی سپاہ سپاہ نادری کی نسبت زیادہ اجڈ تھی۔ لوٹ کا کام دو ماہ تک جاری رہا۔ بعد ازاں سلطنت کے حصے اپنی مرضی سے کر کے امراء میں تقسیم کئے اور شوال ۱۱۷۱ھ کو واپس آگیا۔

(سیر المتاخرین و تاریخ ذکاء اللہ)

## ۴۔ ہندوستان کے افغان صوبے:

ہندوستان ایک مملکت کا نام نہیں ہے۔ یہ دراصل عبارت ہے ایک براعظم سے جو بہت سے ملکوں پر مشتمل ہے۔ شیخ محمد قاسم انیسویں صدی کی تاریخ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں: ہندوستانی ایک قوم نہیں ہے بلکہ یہ مجموعہ ہے مختلف قوموں کا جو نسل و زبان و دین اور اپنی عادات کی بناء پر ایک دوسرے

سے جُدا جُدا ہیں۔

مشہور مورخ مسعودی لکھتا ہے کہ اہلِ علم و نظر و بحث میں سے ایک جماعت کا بیان ہے کہ عہد قدیم میں ہندوستان بڑی عزت و رفعت کا ملک تھا جہاں نیکی اور دانائی کا دور دورہ تھا۔ ہوتے ہوتے ایک زمانہ ایسا آیا کہ ہندوستان میں ایک سلطنت کی بنا رکھی گئی۔ چنانچہ اس کا پہلا بادشاہ برہما اعظم تھا۔ اس نے حکماء کو جمع کیا۔ اسی کے عہد میں کتاب "السند ہند" لکھی گئی اور "دھر الدھور" کے نام سے اس کی تفسیر مرتب ہوئی۔ اس کے بعد میں مجسطی جیسی کتابیں لکھی گئیں اور مجسطی کا ترجمہ بطلیموس کی کتاب ہے۔ برہما کی شخصیت کے بارے میں بڑے اختلافات ہیں۔ بعض لوگ حضرت آدم علیہ السلام سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ ہندوستان کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ برہما بادشاہ کا نام ہے اور یہی بات زیادہ مشہور ہے۔

ہندوستان ایک وسیع و عریض رقبہ ہے۔ اس میں بڑے بڑے میدان، دریا اور پہاڑ ہیں۔ ہندوستان ایک طرف خراسان سے ملا ہوا ہے۔ دوسری طرف تبت سے۔ اور ان ملکوں کے درمیان پہاڑ حد فاصل ہیں۔ ان ملکوں کے درمیان لڑائیاں اور جھگڑے رہتے ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں کی زبانیں جُدا جُدا ہیں۔ رائیں مختلف ہیں۔ چلپی اپنی کتاب "کشف الظنون" میں لکھتا ہے۔ ہندوستان والے اعلیٰ آراء اور عمدہ احکام کے مالک رہے ہیں۔ انہوں نے حساب، ہندسہ، طب، نجوم اور دوسرے طبعی اور الٰہی علوم میں بڑی بڑی تحقیقات کیں۔ ہندوستان کے عام جمہور صابی ہیں اور کواکب کی تعظیم اور ان کے دوروں کے متعلق ان کی خاص رائیں اور مسلک ہیں۔ آزاد بلگرامی "سبحۃ المرجان" میں لکھتا ہے۔ ہندوستان میں کبھی دہلی، سندھ، دکن اور ملتان تک کے علاقے شمار کیا کرتے ہیں۔ کابل ہندوستان اور خراسان کے درمیان ایک برزخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ زمانہ دراز سے یہ ہندوستان کی حکومت میں شامل ہے اور بعض وقت ہندوستان سے صرف دہلی کی سلطنت مراد ہوتی ہے۔

میرے (مولانا سندھی) نزدیک وہ علاقے جہاں کے دریا بہہ کر دریائے سندھ میں گرتے ہیں، مثلاً کابل اور ہندوکش پہاڑ کے جنوب کے اطراف۔ نیز وہ اضلاع جہاں پشتو بولی جاتی ہے جیسا کہ

قندھار اور اس کے اردگرد کا رقبہ ہے۔ یہ سب کے سب ہندوستان کا ایک حصہ ہیں اور پشتو اصل میں سنسکرت زبان سے ہی نکلی ہے۔ میرے خیال میں حکومتوں کے الگ الگ ہونے سے یہ سرزمین ہندوستان سے جدا نہیں ہو سکتی اور میں نے تمام تاریخی شواہد کو لے کر اپنے اس دعویٰ کا ثبوت بہم پالیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض مسلمان مورخ اس علاقہ کو ہندوستان سے الگ مانتے آئے ہیں لیکن یہ ان کی بھول ہے۔ انہوں نے کبھی اس رقبہ کی زبان اور یہاں کے مقامات کے ناموں کی تحقیق کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مولوی ذکاء اللہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں۔ "عربی میں غیر قوموں کے ناموں کی تعریب کر کے لکھنے کا قاعدہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس سبب سے ناموں کا پتہ لگانا نہایت دشوار ہے۔ فرنگی محققین نے ان ناموں کی تحقیق میں بہت سے کورے کاغذ سیاہ کئے مگر بے سود۔ ان ناموں کی تحقیق دراصل ان محققین کا کام ہے جو عربی اور سنسکرت ہر دو زبانوں کے فاضل ہوں۔ وہ سنسکرت دانی سے تحقیق کر سکتے ہیں کہ اصل نام کیا تھا۔ اور عربی دانی سے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ کیونکر اس کی تعریب ہوئی۔ ایک تاریخ میں لکھا ہے کہ بادشاہان کابل کا نام رتبیل، کوئی رتبیل کوئی زنبیل کوئی رتسل کوئی رتبیل اور کوئی رتن بل لکھتا ہے۔ یہ ایک بامعنی ہندو نام ہے۔ یہ بھی محققین نے تحقیق کی ہے کہ کابل میں جو ترک کوہستان تبت سے آئے تھے یہاں کا مذہب بدھ تھا۔ ان ترکوں سے برہمنوں کے ہاتھ اور برہمنوں سے راجپوتوں کے ہاتھ سلطنت منتقل ہوئی۔"

میرے (مولانا سندھی کے) خیال میں جب ترک یہاں آئے اور انہوں نے اپنی بستی بسائی تو یہ جگہ گائیوں کی چراگاہ تھی اور اس کا نام "گوپال" تھا۔ پھر گوپال بگڑ کر کابل۔ جب مسلمانوں نے کابل پر حملہ کیا تو یہاں کا حاکم رام پال نامی تھا جس کے نام کو بگاڑ کر انہوں نے رتبیل بنا دیا۔ واللہ اعلم

## ۱۳۔ حنفی فقہ:

امام ابوحنیفہ انقلابی سیاست کے مالک تھے۔ آپ فقہ کو ایسے طریقہ پر مرتب کرنا چاہتے

تھے کہ ایرانی ذہنیت استحسان سے قبول کر لیگی۔ کتاب و سنت سے استنباط عرب کی ذہنیت
کے لیے بہت مناسب ہے۔ وہ قرآن عظیم پہچان سے سمجھتے ہیں۔ احادیث اور آثار کے متعلق بھی ان
کے علماء کو فن الجرح معلوم ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اکثر مسائل کتاب و سنت سے بہ آسانی مستنبط ہو سکتے
ہیں۔ البتہ بعض دقیق مسائل میں وہ کسی امام کی تقلید کر لیتے ہیں، مگر جب خلافت کا نظام ایرانیوں
کے ہاتھ آگیا۔ ان کی ذہنیت اس طرز تفقہ کی متحمل نہیں تھی اور وہ ہر چیز کو ایک عقلی اصول کے
ذریعہ حل کرنا ضروری جانتے تھے۔

عام طور پر لوگ امام ابو حنیفہ کی فقہ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں عامہ اہل سنت سے
تفرد و اختیار کیا گیا ہے۔ اور یہ امام ابو حنیفہ کی ذہنی تاثیر کا نتیجہ ہے۔ ہم نے جب کتاب الآثار
امام محمد پڑھی تو ہمیں اس شبہ پر ہنسی آئی۔ ہر ایسا قول جس میں امام ابو حنیفہ عام اہل علم سے متفرد
سمجھے گئے اور اس کو شاذ قرار دیا گیا۔ وہ اقوال سب کے سب ابراہیم نخعی سے منقول پائے۔ ابراہیم
نخعی عبد اللہ بن مسعود کے شاگردوں میں ایک مسلم امام ہیں۔ سفیان بن سعید ثوری بھی انہی کے طریقے
کے ایک عالم ہیں۔ آگے چل کر امام بخاری کا ابراہیم نخعی سے خصوصی انتساب ہے۔ بخاری اسحاق
سے، وہ عبد اللہ ابن مبارک سے، وہ سفیان ثوری سے، وہ تلامذۂ ابراہیم نخعی یعنی منصور، اعمش،
حماد، حکم سے روایت کرتے ہیں۔ اول الذکر سفیان کے حدیث میں اور آخر الذکر فقہ میں ان کے
استاد ہیں۔ امام ابو حنیفہ کا یہ خصوصی کمال ہے کہ وہ ابراہیم کی فقہ کو معقول بنا دیتے ہیں۔ اور اس میں
سے آئندہ ضرورت کے مطابق استنباط کرنے کے لیے قواعد وضع کر دیتے ہیں۔ اگر وہ یہ کام نہ کرتے
تو ایرانی تعصب اور تنظیم خلافت کبھی اسلامی فقہ کو نہ چلا سکتے۔

امام ابو حنیفہ کا یہ ایسا احسان ہے جس کی امت اسلامیہ ہمیشہ ممنون رہے گی۔ مگر اس کے ساتھ
ان کی انقلابی سیاست اس فقہ کو کامیاب ہونے نہیں دیتی تھی۔ عام اہل علم ان کا نام سن کر گھبرا جاتے
تھے کہ کہیں ہم بھی حکومت کے عتاب میں نہ آجائیں۔

امام ابو یوسف نے اس مشکل کو حل کر دیا۔ یہ عباسی خلافت کے ساتھ ہو گئے۔ اور امام محمد

کے مسلک یعنی علویوں کی تائید سے دست کش ہو گئے۔ اس طرح عباسی خلافت کو چلانے کے لیے جس قدر قانون کی ضرورت تھی، انہوں نے امام ابو حنیفہ کی فقہ سے مدد لے کر اسے منظم کر دیا۔

بات یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے تک تو فقہا کا مرجع خلیفہ راشد رہا۔ فقہا اپنے اجتہاد پر عمل کرتے اور ان کا اختلاف منتشر شکل میں ظاہر نہ ہوتا تھا۔ اس لیے کہ ان کے عمل کے لئے زمینیں مختلف تھیں۔ مثلاً ایک فقیہ نے مغرب میں ایک طرح کا حکم دیا۔ دوسرے نے مشرق میں اس کے خلاف کیا۔ لوگوں کو یہ علم ہی نہ ہو سکا کہ یہ دو فقیہ مختلف رائے رکھتے ہیں۔ اس سے کوئی وقت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ البتہ جہاں مدینہ منورہ میں ہر زمانہ خلیفہ راشد، اگر فقہا کا اختلاف ظاہر ہوتا تو خلیفۂ راشد کا حکم اس کا فیصلہ کر دیتا۔ اس سے وہ اختلاف کبھی فرقہ کے درجہ تک پہنچ نہیں سکتا تھا۔

اس کے بعد بنی امیہ کے دور میں ساری توجہ فتوحات پر مرکوز رہی اور فقہا کا طرزِ عمل ویسا ہی رہا جیسے خلافت راشدہ میں تھا۔ یعنی مختلف ممالک میں اگر کوئی اختلاف ہوتا تو اس سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا۔ اور صوبوں کے گورنروں کو اپنے اپنے لیے قاضی مقرر کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ جب کبھی مرکز خلافت میں فقہا میں نزاع پیدا ہوتا، تو بنی امیہ کا خلیفہ اتنا علم رکھتا تھا کہ وہ فقہا کے مختلف اقوال سن کر ایک قول کو ترجیح دے سکے۔ ہم نے ہشام بن عبد الملک کے بعض فتاویٰ ایسے دیکھے ہیں کہ ترجیح تک فقہا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور جب خلیفہ ترجیح سے عاجز آ جاتا تو فقہائے مدینہ کا فیصلہ دریافت کر لیتا۔ واضح رہے کہ بنی امیہ نے علمی مرکز مدینہ ہی میں رہنے دیا تھا۔ اسے دمشق میں منتقل نہیں کیا تھا۔ البتہ عباسیوں نے سیاسی مرکز اگر بغداد کو بنایا تو علمی مرکز بھی وہیں منتقل کر لیا۔ اسی لئے ان کے خلیفہ نے امام مالکؒ سے کہا کہ مؤطا کی تعلیم بجائے مدینہ کے بغداد میں آ کر دیجئے۔ مگر امام مالکؒ مرکز کو چھوڑنے پر کب تیار ہو سکتے تھے، انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

اب عباسی دور میں ایک نئی چیز پیدا ہوتی ہے۔ مدینہ منورہ کے بجائے بغداد علمی مرکز بنتا ہے لیکن عباسی خلفاء میں اتنی اہلیت نہیں رہ جاتی کہ وہ مختلف اقوالِ فقہ میں ترجیح دینے کی استعداد رکھیں،

جیسے بنی امیہ کے خلفاء میں تھی۔ چنانچہ خلافت کے تمام اطراف بعیدہ سے مختلف فتاوی مرکز میں جمع ہونے لگے۔ اس لیے کہ اب حکمران طاقت ایمانی ہے۔ وہ کسی فقیہ کے فتوی کو نہ چھوڑ سکتی ہے نہ ترجیح دے سکتی ہے۔ صوبہ کے گورنروں کے اختیارات بھی محدود ہیں، اس لیے ہر اختلاف کو وہ بھی مرکز کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔

ان حالات میں خلیفہ کے ساتھ ایک زبردست عالم کا ہونا ضروری تھا، جو ان تمام جھگڑوں سے اس کو نجات دلا سکے۔ اس سلسلے میں پہلے پہل خلیفہ منصور عباسی نے سعی کی کہ علمائے اہل مدینہ اس کے طرفدار بنیں مگر ان سے اس کا توافق نہ ہو سکا۔ اب منصور محتاج ہوا کہ اہل عراق کے فقہاء سے استمداد کرے۔ وہ امام ابوحنیفہ کو اس کا اہل سمجھتا تھا، مگر حضرت امام کے سیاسی اختلافات کے باعث وہ ان سے استفادہ نہ کر سکا۔ امام ابویوسف نے یہ ہمت دکھائی اور تمام ممالک خلافت کی قضا کو منظم کر دیا، جس سے آپ کا لقب قاضی القضاۃ العالم ہوا۔ آپ نے صوبوں میں مختلف مراتب قائم کر کے مرکز خلافت کو اپیل کی آخری عدالت بنا دیا، لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ تمام قلمرو میں ایک ہی قانون نافذ ہو۔ امام ابویوسف نے امام ابوحنیفہ کی فقہ پر غور کر کے ایک قابل عمل نظام مرتب کر لیا۔ اور امام محمد بن حسن شیبانی کو اس کی تعلیم کے لیے مخصوص کر دیا۔ اب جو قاضی امام محمد کے یہاں سے پڑھ کر نکلا، فقط وہی کسی مملکت میں قاضی بنایا جاتا۔ چھوٹے قاضی وہ اپنے تلامذہ سے منتخب کر کے مقرر کر دیتا تھا۔ اس طرح ان دو بزرگوں (ابویوسف و محمد) کے اتفاق سے تمام ممالک خلافت ایک قانون کے پابند ہو گئے۔

یہ خلافت عباسیہ کا سب سے قابل فخر زمانہ ہے۔ اس میں امام ابوحنیفہ کا کمال جس قدر مانا جائے گا، اس کے ساتھ امام ابویوسف اور امام محمد بھی فراموش نہیں کیے جا سکتے۔ یہ ہے فقہ حنفی اور ائمہ حنفیہ کی حقیقت۔

ہمارے خیال میں جو کام امام ابویوسف اور امام محمد مرحوم نے کیا، شاہ ولی اللہ کی فقہ التصوف اور حدیث کو رواج دینے میں وہ اکیلے امام عبدالعزیز نے کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے دو بھائی شاہ

رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر ان کے معاون تھے۔ مگر فیصلہ کن رائے فقط شاہ عبدالعزیز کی ہوتی
تھی۔ ان دونوں کے اس تعاون نے ہندوستان کو عالمگیر کے بعد پھر ایک دفعہ ایک قانون (فقہ
حنفی عزیزی) کا پابند بنا دیا۔ اب آپ ہندوستان میں کوئی عالم حنفی نہیں پائیں گے جس پر شاہ
عبدالعزیز کا احسان نہ ہو۔ مسلک اور باطنی ہر اجتماع میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے کوئی اجتماعی
قوت بڑا نام نہیں ہو سکی۔

## ۲۳ ہندوستان میں شیعی دعوت

سلطان محمود نے ۳۹۱ھ میں ہندوستان پر حملہ کیا اور پشاور کے قریب مقام ہنڈ پر جے پال والی
لاہور کی فوج کو شکست دی۔ نواح ملتان میں اس سے پہلے قرامطہ نے اپنی سلطنت قائم کر رکھی تھی۔
ملتان کا مشہور عظیم الشان مندر جسے محمد بن قاسم ثقفی نے محض اس لیے نہ چھیڑا تھا کہ وہ ما بدلا و ککنائس
النصاری والیہود و بیوت النیران للمجوس
(یعنی کا یہ مندر نصاریٰ کے گرجوں، یہودیوں کی عبادت گاہوں، مجوسیوں کے آتش کدوں
کے حکم میں آتا ہے) قرامطہ نے اس کو مسمار کر کے وہاں اپنا گورنمنٹ ہاؤس تعمیر کر لیا
تھا۔ سلطان محمود نے قرامطہ کو شکست دے کر اس عمارت کو مسجد کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ اس واقعہ
پر ایک زمانہ دراز گزرنے کے بعد جب ہمایوں ہندوستان سے فرار ہوا تو وہ سیدھا شاہ اسمٰعیل صفوی
کے پاس ایران پہنچا۔ اس نے ایرانی حکومت سے ایک باقاعدہ معاہدہ کر کے ایران سے فوجی امداد
لی اور پھر کامیاب ہوا۔ وہ معاہدہ کیا تھا؟ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ہمارے نزدیک ہمایوں ایران کی تابعداری کا وعدہ کر آیا تھا اور اسی لیے اکبر کو ملکی حکومت
پیدا کرنے استقلال کے دعویٰ کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ اس نے ہندوؤں کو ساتھ ملا لیا تا کہ ملکی حکومت
بن جائے اور ایرانی حکومت سے کہہ سکے کہ جس حکومت نے تابعداری کا وعدہ کیا تھا، وہ نہیں رہی
اور اس کے بجائے ایک نئی قومی ملکی حکومت قائم ہے۔ یہ ہے معاہدہ۔ معلوم رہے ذرہ برابر تعلق نہیں۔ واضح
رہے کہ ہندوؤں کا ملانا اکبر کی ایجاد نہیں، شیر شاہ، فیروز شاہ، ناصر الدین خسرو یہ کام پہلے کر چکے تھے۔ مگر

ملکی حکومت بنانا یہ اکبر کی ایجاد اور اس کی اختراع ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہمایوں کا بیرم خان والد عبدالرحیم خانخاناں کے توسل سے شاہ ایران سے معاہدہ ہوا۔ ورنہ شاہِ ایران دل سے ہمایوں کو امداد دینا نہیں چاہتا تھا۔ جب ہمایوں نے منظور کر لیا کہ میں شیعہ مذہب کو ہندوستان میں رائج کروں گا اور شیعہ ایجنٹ بیرم خان کو اپنے ساتھ رکھوں گا تب کہیں جاکر اسے امداد دی گئی۔ ہمایوں کے بعد جب اکبر تخت نشین ہوا اور اس کو اپنی سلطنت کی حقیقت سمجھ میں آئی تو سب سے پہلے اس نے بیرم خان کو علیحدہ کیا۔ بیرم خان ایران کی راہ سے حج کو جانا چاہتا تھا۔ اکبر نے اس کو روک دیا اور پھر قتل کرا دیا۔ اس کے بعد کوئی ایجنٹ ایران سے نہیں آیا۔ اکبر نے ایرانی اثر کی بیخ کنی کے لیے ہندوستان سے "اسلامی حکومت" کو ختم کر کے اس کے بجائے ملکی حکومت پیدا کی۔ اب اس پر نہ تو کوئی سُنّی خلیفہ زور ڈال سکتا تھا اور نہ کوئی شیعہ بادشاہ تحکم چلا سکتا تھا۔ اکبر جیسا انصاف پسند بادشاہ ہندوستان نے پیدا نہیں کیا۔ قانون کے سامنے اس کا بیٹا اور دشمن دونوں مساوی تھے۔

شمالی ہند کے علاوہ جنوبی ہند میں گولکنڈہ شیعوں کا مرکز تھا۔ جہاں تانا شاہ برسرِ حکومت تھا۔ اسے سلطان عالمگیر نے ختم کر دیا۔ اذ غرہ ذیقعدہ ۱۰۹۸ھ میں ابوالحسن گرفتار ہو کر دولت آباد کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ سیر المتاخرین کا شیعہ مصنف لکھتا ہے۔

"گولکنڈہ کے قلعے کے استحکام، سرزمین حیدرآباد کی خوبی اور اس کی آب و ہوا کی لطافت کو کوئی کہاں تک بیان کرے۔ وہاں کا بادشاہ ابوالحسن لہو و لعب اور عیش و طرب میں اوروں سے زیادہ منہمک ہو گیا اور اس کی وجہ سے ملک میں بھی فسق و فجور کا عام رواج ہو گیا۔ عالمگیر نے جو بظاہر اپنے آپ کو اہلِ اصلاح میں سے جتلاتا تھا اور اپنے آپ کو تارکِ دنیا کی شکل میں ظاہر کرتا تھا، حیدرآباد کو دار الجہاد قرار دیا۔ چنانچہ وہاں کے باشندے بے دریغ قتل کیے گئے اور اس شہر کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ اصل میں عالمگیر کا مقصد ابوالحسن کے شہرۂ آفاق خزانوں کو ہتھیانا، وہاں کے علمائے شیعہ کا استیصال کرنا اور عام مومنین کو اپنا مطیع و فرمانبردار بنانا تھا۔"

اس کے بعد محمد شاہ کے آخری عہد میں لکھنؤ شیعوں کا مرکز تھا۔ اس مرکز سے دہلی پر غلبہ حاصل

کرنے کی مسلسل سعی جاری رہی۔ اس کو روکنے کے لیے شاہ عبدالعزیز نے "تحفہ اثنا عشریہ" کی دیوار کھڑی کی۔ جب عوام شیعیت کے پراپگنڈے سے متاثر نہ ہوں تب کہیں انہیں "ازالۃ الخفاء" پڑھائی جا سکتی ہے۔

الخطیب ابی زرعہ رازی سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جس شخص کو تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں نقص نکالتے پاؤ۔ اس کو زندیق سمجھو۔ کیا یہ واقعہ نہیں کہ رسول حق ہیں، قرآن حق ہے اور رسول نے جس امر کی دعوت دی وہ بھی حق ہے۔ اب رسول، قرآن اور رسول کی دعوت کا سارا حال ہمیں صحابہ کے واسطے سے معلوم ہوا۔ چنانچہ صحابہ کے نقص نکالنے والے اصل میں کتاب اور سنت کو باطل کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ بے شک یہ لوگ زندیق ہیں (الاصابہ صفحہ ۱)

ہارون الرشید کے سامنے زندیقوں کا سردار شاکر لایا گیا، ہارون نے اس کی گردن مارنے کا ارادہ کیا۔ اسی جلسے میں شاکر سے پوچھا گیا کہ تم لوگ سب سے پہلے اپنے شاگردوں کو صحابہ کے انکار اور "قدر" کی تعلیم کیوں دیتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ صحابہ کے انکار سے دوسرے لفظوں میں یہ مقصود ہے کہ جس دین کو وہ نقل کرتے ہیں وہ باطل ہے۔ کیونکہ جب نقل کرنے والا مشکوک ہے تو جو چیز وہ نقل کرے گا وہ کس طرح قابل اطمینان ہو سکتی ہے۔ خطیب بغداد صفحہ ۳۰۸ امام فضل اللہ شیخ سعدی کے معاصر تورپشتی حنفی جن کے حالات "طبقات الحنفیہ" میں ہیں اپنی کتاب "المعتمد" باب سوم فصل چہارم میں لکھتے ہیں۔ "جو لوگ ابوبکرؓ کی خلافت پر اعتراض کرتے ہیں وہ گویا تمام صحابہ پر زبان طعن کھولتے ہیں۔ اور صحابہ کو مطعون کرنا دراصل دین کی اساس کو مطعون قرار دینا ہے۔ کیونکہ قرآن، احادیث اور ان کے متعلقہ احکام ہم تک صحابہ ہی کے واسطے سے پہنچے ہیں۔ اگر صحابہ ان کے قول کے مطابق غلط ہوتے تو ظاہر ہے جو چیز انہوں نے نقل کی وہ کس طرح قابل اعتبار ہو سکتی ہے۔۔ الغرض صحابہ کو اس طرح مطعون کرنے سے شریعت ہی کالعدم ہو جاتی ہے۔

(۱) الیواقیت والجواہر للشعرانی صفحہ ۲۳۶ ج ۲

## ۳۲ مولانا رفیع الدین

مولانا رفیع الدین کی تصنیف "اسرار المحبۃ" کا ایک قدیم نسخہ پرنسپل مولوی محمد شفیع صاحب
اورینٹل کالج لاہور کی لائبریری میں موجود ہے۔ گزشتہ ماہ اگست ۱۹۶۲ء میں خاکسار راقم نے اس سے
استفادہ کیا۔ نقل لینے کا ارادہ تھا لیکن ناگہاں بیمار پڑنے کے باعث یہ کام سرانجام نہ پا سکا۔ تعلق
اللہ بصحت بعض فوائد اسرار رسالہ مذکور میں یہ دکھایا گیا ہے کہ محبت سب اشیاء میں ساری ہے
اور قرآن حکیم کی جس قدر آیتیں محبت کے متعلق ہیں مصنف ان کو ساتھ ساتھ حل کرتے جاتے ہیں
اس موضوع پر صرف فارابی اور بو علی سینا نے کچھ لکھا ہے۔ بو علی سینا کا ایک قصیدہ ہے جس کا مطلع
ہے:۔ هبطت الیک من المکان الارفع (یعنی محبت) ایک بلند مرتبت مقام سے تیری طرف
نازل ہوتی ہے)

اس کے جواب میں آپ نے ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے:۔

عجبا لشیخ فیلسوف العجمی۔ خفیت علیہ منارۃ من شرعی (اس قدیم فلسفی شیخ پر تعجب
تعجب ہے کہ اس پر شریعت کا روشن منارہ مخفی رہا)

اس قصیدہ کا مقطع یہ ہے:۔

ثم الصلوۃ علی النبی والہ والحمد للہ العلی الارفع

(پھر نبی اور آپ کی آل پر درود و سلام اور حمد و ثنا خدائے بلند و برتر کے لیے) رسالہ اسرار
المحبۃ کے تین حصے ہیں۔ تحصیل، تذییل، تفصیل۔ دیکھو ابجد العلوم صفحہ ۲۵۴۔
رسالہ تکمیل الاذہان کا اکثر حصہ ابجد العلوم میں آ چکا ہے۔ ملاحظہ ہو صفحات ۱۲۷ تا ۱۴۲، ۲۲۳ تا ۲۴۲
یہ مبالغہ ہو دیگر حصہ منطق کے ماسوا ساری کتاب ابجد میں آ گئی ہے۔ اس کتاب کے مختلف نسخے حسب
ذیل مقامات پر موجود ہیں۔

(۱) پیر صاحب العلم سندھ کے کتاب خانہ میں اس کا ایک نسخہ تھا جس سے راقم عاجز نے اپنا نسخہ نقل کیا اور نسخہ منقولہ اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ (۲) حافظ عبد العزیز ولد مولوی احمد صاحب بہاولپور۔ (۳) مولوی عبد التواب ملتانی (۴) مولوی عبد العزیز یا مولوی عبد التواب کے نسخہ سے مولانا نجم الدین صاحب سابق ہیڈ مولوی اورینٹل کالج نے اپنا نسخہ نقل کرایا۔ (۵) مولوی سلطان محمود ملتانی۔

شاہ رفیع الدین کی تصانیف کی ایک عام خصوصیت شیخ محسن نے "یانع جنی" میں یہ بیان کی ہے کہ ان میں بکثرت رموز خفیہ درج ہوتی ہیں جن پر بمشکل اطلاع نصیب ہوتی ہے نیز یہ کہ وہ تھوڑے سے الفاظ میں جہاں معنی آباد کر دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں خصوصیتیں تکمیل الاذہان میں نمایاں ہیں۔ کتاب مذکور میں چار باب ہیں۔ منطق، فن تحصیل، امور عامہ، تطبیق الآراء۔ ایسی جامع کتاب پہلے نہیں لکھی گئی (نور الحق علوی)

۳۔ رسالہ "حملۃ العرش" کا تذکرہ شیخ محسن نے "یانع جنی" میں کیا ہے۔ تفسیر عزیزی مطبوعہ بمبئی میں آیت " وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ " کی تفسیر میں شاہ عبد العزیز نے وہ رسالہ نقل کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں "برادر فضائل آئین کمالات آگیں شیخ محمد رفیع الدین سلمہ اللہ وزادہ فی الدنیا والدین فتوحا و برکاتا متواترا و متوالیا۔ در بعض تصنیفات خود چنین نوشتہ اند کہ حملۃ العرش جمیعے باشند کہ حامل کمالات اربعہ الٰہیہ اند یعنی ابداع و خلق و تدبیر و تدلی الخ" (صفحہ ۹۴) "اللہ آپ کو سلامت رکھے اور دنیا اور دین میں اپنی مسلسل اور پیہم برکتوں اور فیوض سے نوازے۔ آپ نے اپنی بعض تصنیفات میں یوں لکھا ہے کہ "حملۃ العرش" (فرشتوں کی) وہ جماعت ہے جو ان چار کمالات۔ ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی کی حامل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (صفحہ ۹۴) مگر گمان غالب یہ ہے کہ منقول شدہ عبارت رسالہ مذکور کا ٹکڑا ہے۔ پورا رسالہ نہیں (واللہ اعلم محمد نور الحق)

تفسیر آیت نور۔ شیخ محسن نے "یانع جنی" میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ تفسیر آیت "اللہ

نور السموات والارض " رسالہ " سطعات " از حکیم الہند امام ولی اللہ میں موجود ہے۔ شاہ رفیع الدین کا یہ رسالہ اسی کی تکمیل ہے۔ دوسرے حکماء اس مسئلے کو کس طرح حل کرتے ہیں، وہ سب اقوال اس میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس میں ایک نئی بات یہ ہے کہ پہلے حکماء کے چار فرقے بیان کئے جنہوں نے حقائق اشیاء پر بحث کی ہے۔ پانچویں فرقے کا امام اپنے والد ماجد کو لکھا ہے کہتے ہیں فھو امامھم فکرا و اجمعھم علما یعنی وہ فکر صحیح اور جامعیت رکھتے ہیں۔

پھر ہر مسئلے میں پانچوں مذہب علیحدہ علیحدہ نقل کرتے جاتے ہیں۔ وہ مذاہب حسب ذیل ہیں (سلف اہل حدیث متکلمین) (صوفیائے کرام) (حکماء اشراقیہ و مشائیہ) یہ چاروں فرقے حقائق اشیاء یعنی ان کی حقیقت سے بحث کرتے ہیں لیکن امام ولی اللہ کا مسلک ان سب سے اجمع، اتم اور الیق ہے۔ رسالہ مذکورہ کا ایک نسخہ ریاست بہاولپور کے شہر احمد پور شرقیہ میں مولوی عبدالعزیز ولد مولوی احمد صاحب کے کتب خانے میں موجود ہے۔ ہمارے پاس بھی مکہ معظمہ میں اس کی ایک نقل پہنچی۔ معلوم نہیں کہ ہماری کتابوں کے ساتھ اس کو بھی ہندوستان لایا گیا ہے یا نہیں

## ۲۔ شیخ خالد کردیؒ

حضرت شیخ غلام علی (معروف عبداللہ) مجددی مظہری مجددین مائۃ ثالث عشر میں شمار ہوتے ہیں۔ دہلی کی خانقاہ مجددیہ انہیں کے نام سے آباد ہے۔ آپ کی ذات سے اس قدر فیض جاری ہوا کہ بقول شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی، شاید ہی اگلے مشائخ میں کسی سے اس قدر فیض ہوا ہو۔ ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا شہر تھا جہاں آپ کا کوئی خلیفہ نہ ہو۔ صرف ایک شہر پٹنہ میں آپ کے پچاس خلفاء تھے۔ آپ ہی کے خلیفہ شیخ خالد کردی تھے جن کے مناقب میں علامہ شامی نے مستقل رسالہ تالیف فرمایا جس کا نام " سل الحسام الہندی لنصرۃ مولانا خالد النقشبندی " تھا۔ یہ رسالہ مصر میں طبع ہو چکا ہے۔ اس میں ان کا ۱۲۲۴ھ میں براہ ایران ہو کر ایک سال کے سفر کے بعد دہلی پہنچنا، شاہ غلام علی کی خدمت میں پہنچ کر فیض یاب ہو کر قطب ارشاد بن کر

واپس وطن جانا اور وہاں مرجع خاص و عام ہونا، ان سب باتوں کا مفصل ذکر ہے۔

اس رسالے میں لکھا ہے کہ جس شام کو مولانا خالد کردی دہلی پہنچے تو آپ نے ایک زوردار قصیدہ لکھا جس میں آپ نے اپنے سفر کے حالات بیان کرتے ہوئے اپنے مرشد کی تعریف کی ہے اس قصیدے کے پہلے اشعار یہ ہیں۔

کملت مسافة کعبة الآمال حمدا لمن قد من بالاکمال

من نور الافاق بعد اظلامها وهدی جمیع الخلق بعد ضلال

اعنی غلام علی القرم الذی من لحظه یحیی العظام البال

آرزوؤں کے کعبے کی مسافت پوری ہو گئی۔ حمد و ثنا اس ذات کی جس نے کمال تک پہنچنے کا مجھ پر احسان کیا جس نے اندھیرے آفاق کو روشن کر دیا اور گمراہی کے بعد تمام خلقت کو ہدایت کی راہ دکھائی۔ میری مراد رہنما و پیشوا غلام علی سے ہے۔ جو اپنی نظروں سے بوسیدہ ہڈیوں کو نئی زندگی دیتا ہے۔

شیخ محسن نے اپنی کتاب "یانع جنی" میں اس قصیدہ کو پورے کا پورا نقل کر دیا ہے۔

شیخ مراد القزوانی "نفحات" کے ذیل میں لکھتے ہیں۔ شیخ غلام علی ۱۱۵۸ھ میں بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب حضرت علیؓ سے ملتا ہے۔ آپ دہلی میں مولانا مظہر جانجاناں کی خدمت میں پہنچے اور پورے پندرہ سال تک ان سے اخذ فیض کرتے رہے۔ بعد میں آپ اتنے مشہور ہوئے کہ دور و نزدیک سے طالبان ہدایت آپ کے پاس پہنچتے تھے۔ چنانچہ آپ سے فیض پانے والے زمین کے ہر حصہ میں، شرق و غرب میں اور عرب و عجم میں پھیل گئے۔

شیخ کردی کا نسب باپ کی طرف سے تو سیدنا عثمان سے ملتا ہے اور آپ کی ماں سادات علویہ میں سے تھیں۔ موصوف نے شیخ عبد اللہ (غلام علی) سے نقشبندی مجددی طریقہ لیا۔ پھر بعد میں آپ شاہ عبد العزیز کی مجلس میں بیٹھے جو اپنے زمانے کے ملک العلماء تھے۔ شیخ خالد کردی کے مرشد شیخ غلام علی نے انہیں شاہ عبد العزیز کے پاس جانے کو کہا تھا۔ شاہ صاحب نے شیخ موصوف

کو اپنے علوم کی روایات کرنے کی اجازت دی۔ آپ کی وفات ۱۲۴۲ھ میں ہوئی۔

شاہ عبدالغنی محدث دہلوی نے شیخ خالد کا ایک فارسی قصیدہ نقل کیا ہے جس کے انسٹھ شعر ہیں مطلع اور زمین ملاحظہ ہو ۔

خبر از من رسید آں شاہ خوباں را بہ پنہانی ۔۔۔ کہ عالم زندہ شد بار دگر از ابر نیسانی

شیخ کی مدح میں کہتے ہیں ۔

امام اولیا سیاح بیدائے خدا بینی ۔۔۔ ندیم کبریا ملاح دریائے خدادانی

معین راہ پیمایاں شمع جمع اولیائے دیں ۔۔۔ دلیل پیشوایاں قبلۂ اعیان صمدانی

چراغ افروز بینش مہر برج دانش و بینش ۔۔۔ کلید گنج حکمت محرم اسرار سبحانی

ازیں تحدیث عبداللہ شد گر التفات تو ۔۔۔ دہد سنگ سیاہ خاصیت لعل بدخشانی

مقطع ۔

ز جام فیض خود کن خالد درماندہ را سیراب ۔۔۔ کہ او لب تشنہ مستسقی و تو دریائے احسانی

اسی قصیدہ کا وہ شعر ہے جو متن میں درج ہے ۔

بدیں ظلمت کہ فرما است گفتند و بدل گفتم ۔۔۔ بظلمت رو اگر جوئی تو آب حیوانی

حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلوی مہاجر مدنی اپنے رسالہ "تذکرہ حضرت شاہ غلام علی" میں لکھتے ہیں: "مولانا خالد شہرزوری کردی نے علماء ہند میں سے حضرت شاہ عبدالعزیز کی مدح کی ہے"

(شیخ محسن صفحہ ۱۵۲ فرزند ارحق)

میں (مولانا سندھی) نے مکہ معظمہ میں خالد کردی کے مطبوعہ مکاتیب دیکھے۔ سال بھر میں ایک بار وہ دہلی ایک خط لکھا کرتے تھے اور حجاج کی معرفت خط پہنچانے کا انتظام تھا۔ خط میں مولانا محمد اسماعیل شہید کا تذکرہ اس طرح کرتے جیسے کوئی کسی کا دل سوز دوست ہو۔ ساتھ ہی شیخ خالد مولانا شہید کے علمی ترفع کے بھی بہت زیادہ معترف ہیں۔ ان خطوط میں "حضرات ثلاثہ" کی اصطلاح خاص طور پر برتی جاتی ہے "حضرات ثلاثہ" کا لفظ اہل دہلی کی زبان میں امام عبدالعزیز اور ان کے

وہ بعض نیتوں مولانا رفیع الدین اور مولانا عبدالقادر کے لیے بولا جاتا تھا۔

## ۴۵ شیخ محمد بن عبدالوہاب

شیخ محمد بن عبدالوہاب ابن سلیمان ہیں۔ شیخ موصوف ۱۱۱۵ھ میں نجد کی بستی عینیہ میں پیدا ہوئے اور آپ ہی کی طرف وہابی جماعت منسوب کی جاتی ہے۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب نے جب اپنی تبلیغ شروع کی تو موصوف درعیہ تشریف لے گئے۔ اور وہاں کے امیر محمد بن سعود نے آپ کی حمایت کر لی۔ یہ واقعہ ۱۱۵۹ھ کا ہے اس کے بعد وہابی تحریک کو بڑا فروغ ہوا اور نجد اور عمان تک اس کا اثر پھیل گیا۔ ۱۲۱۸ھ میں حجاز اور یمن پر بھی وہابیوں کی عملداری ہو گئی۔

امام شوکانی کے شاگرد محمد بن ناصر حازمی لکھتے ہیں۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب صاحب علم بزرگ تھے۔ آپ کا طبعاً دینی عبادت کی طرف رجحان تھا۔ موصوف کے رسالے مشہور عام ہیں۔ ان میں سے بعض تو قابل قبول ہیں اور بعض ایسے ہیں جو رد کئے جاتے ہیں۔ شیخ موصوف کی دو باتیں ہیں جو پسند نہیں کی جاتیں۔ ایک تو یہ ہے کہ انہوں نے چند بے اساس امور کی بنا پر تمام دنیا کو کافر قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ داؤد بن سلیمان نے شیخ موصوف کے اس دعوے کو نہایت مناسب رد لکھا ہے۔ ان کی دوسری زیادتی یہ تھی کہ بنا کسی دلیل و حجت کے انہوں نے بے گناہوں کو قتل کرنے کی اجازت دی۔ چنانچہ شیخ موصوف یہ اعلان کیا کرتے تھے کہ جس نے خدا کے سوا کسی اور سے دعا کی یا کسی نبی، بادشاہ اور عالم کو اس میں وسیلہ بنایا تو وہ مشرک ہے خواہ وہ اس سے بے خبر ہو یا اس کا انکار کرے۔ اگر وہ اس کا عقیدہ رکھتا ہو یا اس کو نہ مانتا ہو۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے روئے زمین کے سب مسلمانوں کو تکفیر کا نشانہ بنا دیا۔ چنانچہ جو مسلمان اولیاء سے دعا کرتے ہیں ان کو موصوف نے کافر قرار دیا۔ اور جو ان کے کفر میں شک کرے، شیخ موصوف نے ان شک کرنے والوں کو بھی کافر ثابت کیا۔

آپ ان لوگوں سے جو آپ کے مخالف تھے جہاد کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ جس طرح بھی بس

چلے ان کو قتل کرنا روا جانتے تھے اور ان کے مال و دولت کو لوٹنے کی اجازت دیتے تھے۔ موصوف نے اس طرح دنیا جہان کے مسلمانوں کو زمرۂ کفار میں داخل کر دیا۔ گو شیخ نے شریعت کے ایک حصے کو جانا تو ضرور لیکن آپ نے اس میں امعانِ نظر سے کام نہ لیا۔ دراصل موصوف نے کسی ایسے استاد سے علم حاصل نہ کیا تھا جو انہیں صحیح ہدایت کی راہ پر لگاتا۔ فتح مندِ علوم کی طرف ان کی رہنمائی کرتا اور دین کے معاملات میں ان میں تفقہ اور سمجھ پیدا کرتا۔ طلبِ علم کے سلسلے میں موصوف نے صرف اتنا کیا کہ شیخ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد ابن قیم کی بعض کتابیں پڑھ لیں اور ان کی تقلید کی۔ درآں حالیکہ یہ دونوں بزرگ تقلید کو جائز نہ سمجھتے تھے۔

شیخ سید محمد امین جو ابن عابدین کے نام سے مشہور ہیں شرح الدر المختار میں باغیوں کے ذکر میں لکھتے ہیں "ان کی مثال ایسے ہی ہے جیسا کہ ہمارے زمانے میں محمد بن عبد الوہاب کو ماننے والے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں یہ لوگ نجد سے نکلے اور حرمین پر قابض ہو گئے۔ یہ اپنے آپ کو حنبلی مذہب کے پیرو کہتے ہیں۔ لیکن ان کا خیال یہ ہے کہ اپنے سوا باقی سب مسلمانوں کو جو ان کے اعتقادات کے مخالف ہوں، کافر سمجھتے ہیں۔ اور ان کا خون بہانا جائز جانتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اہلِ سنت اور ان کے علماء کو قتل کرنے میں دریغ نہ کیا۔ ۱۲۳۳ھ میں اللہ تعالیٰ نے ان کی طاقت کو توڑا اور ان پر مسلمانوں کے لشکر کو فتح دی۔"

محرم کی آٹھویں تاریخ ۱۲۱۶ھ میں ہفتے کے روز دن دہاڑے انہوں نے حرمِ محترم پر حملہ کیا تھا۔ شیخ محمد بن عبد الوہاب اس سے پہلے ۱۲۰۶ھ میں انتقال کر چکے تھے۔ یہ حملہ شیخ موصوف کے صاحبزادے عبد اللہ بن عبد الوہاب کے عہد میں ہوا۔ (ابجد العلوم صفحہ ۸۹۰)

## ۲۳۔ طریقۂ امام ولی اللہ و طریقۂ محمد بن عبد الوہاب

نواب صدیق حسن خان "حطۃ" میں لکھتے ہیں "امام ولی اللہ دہلوی کا مسلک یہ ہے کہ وہ زیرِ بحث مسائل کو اول تو کتاب اور سنت کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ پھر ان کے متعلق فقہ کے

جو اقوال اور آراء ہیں، ان کو کتاب اور سنت کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ جو فقہی اقوال ان دونوں پر پورے اتریں، انہیں تو قبول کر لیتے ہیں۔ اور جو ان کے خلاف نظر آئیں، انہیں رد کر دیتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ کسی شخصیت کی پروا نہیں کرتے۔ یہی کیفیت ان کے پوتے مولانا محمد اسماعیل شہید کی ہے۔ موصوف نے اپنے جد امجد کے اسی طریقہ کی پیروی کی۔ اور خدانخواستہ جیسا کہ جاہل سمجھتے ہیں آپ نے اسلام میں کوئی نئی بات اپنی طرف سے جاری نہیں کی۔ شاہ اسماعیل شہید کا یہ طریقہ حنفی فقہ کے خلاف نہ تھا اور یہی وہ شاہراہ شریعت ہے جس پر اسلاف اور ان کے بعد آنے والے چلتے رہے۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سے مردہ سنتوں کو زندہ کیا، بہت سے مشرکوں اور بدعتیوں کو مٹایا اور خدا نے انہیں شہادت فی سبیل اللہ کا درجہ عطا فرمایا۔ لیکن خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں نے مرحوم کے معاملے میں بے جا تعصب برتا۔ اور ان کے ساتھیوں اور ان کے پیروؤں سے ناروا طور پر دشمنی کی چنانچہ ان کے طریقہ کو شیخ محمد عبد الوہاب سے منسوب کر دیا۔ اور انہیں وہابی کہنے لگے حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ یہ بزرگ نہ نجد کو جانتے تھے اور نہ صاحب نجد کو۔ یہ گھرانا حنفی فقہ کا متبع اور پاک نفوس کا حامل تھا۔

مولانا شہید نے اپنی کتاب "تقویۃ الایمان" میں "توسل فی الدعاء" کو جائز اور شرک اصغر کے مرتکب کو کافر نہ مانتے ہوئے غیر مغفور قرار دیا ہے۔ یہ دو ایسے مسئلے ہیں جو محمد بن عبد الوہاب کی کتاب التوحید کے مناقض ہیں۔

"توسل فی الدعاء" سے مراد یہ ہے۔ مثلاً خدا تعالیٰ سے دعا کی جائے بحرمت فلاں یا بحق فلاں کہہ کر۔ تو اس توسل کو ابن عبد الوہاب نہایت شدت سے ممنوع قرار دیتے ہیں۔ مولانا محمد اسماعیل کے ہاں یہ توسل ناجائز نہیں ہے۔ تقویۃ الایمان میں وہ اس کے جواز کی تصریح کرتے ہیں۔ لیکن "یا شیخ عبد القادر شیئاً للہ" میں جہاں ذات اپنی کو توسل کے ذریعہ بنایا گیا ہے ہر دو کے ہاں ناجائز ہے۔ یہ ہے توسل فی الدعاء کا مسئلہ۔ جس میں ہر دو طرف ایک دوسرے

کی تفصیل یہ ہیں۔

شرک اصغر کا مسئلہ حسب ذیل ہے: آیت اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء۔ ۱۱۶) بے شک اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے۔ اور اس کے سوا (اور گناہ) جس کو چاہے بخش دے گا۔ کی تفسیر میں ہر دو کا اختلاف ہے۔ اس آیت کا ظاہری اقتضا یہی ہے کہ شرک غیر مغفور ہے اور ماورائے شرک دوسرے کبائر قابل مغفرت ہیں۔ یہ اس آیت کا ظاہری تقاضا ہے۔ اب شرک کا لفظ دو چیزوں پر اطلاق ہوتا ہے۔ شرک اکبر و شرک اصغر۔ شرک اکبر تو یقیناً کفر ہے۔ اہل اسلام میں سے کسی شخص کو بھی اس میں اختلاف نہیں۔ بے شک وہ غیر مغفور اور ابدی عذاب کا باعث ہے۔ شرک اصغر کو اہل علم کبائر میں شمار کرتے۔ محمد ابن عبدالوہاب اس کو شرک اکبر سے ملاتے ہیں۔ چونکہ نص میں عموم ہے۔ اس لیے وہ اس میں تخصیص کی اجازت نہیں دیتے۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو مسلمان شرک اصغر میں مبتلا ہو، اس کا اسلام ان کے ہاں مقبول نہیں ہے۔ مثلاً "ریا" اور "من حلف بغیر اللہ فقد اشرک" جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی پس اس نے شرک کیا۔ وغیرہ امور۔ یہاں عام اہل علم اور ابن عبدالوہاب کا اختلاف واضح ہو گیا۔

مولانا رشید میاں حکم کے طور پر ایک فیصلہ کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں: شرک اصغر کی بھی جس قدر سزا مقرر ہے۔ وہ مغفور نہیں ہوگی۔ شرک اصغر کبائر میں شامل نہیں۔ اس کی سزا اس کے مرتکب کو ضروری طور پر بھگتنا پڑے گی۔ مگر وہ کفر کے برابر نہیں کہ ابدیت عذاب اس میں ثابت ہو۔ ابن عبدالوہاب آیت مذکورہ میں شرک کی تخصیص سے مانع تھے۔ ہم نے بھی اس کی تخصیص نہیں کی بلکہ اس کا عموم بحال رکھا۔ اور عموم بحال رکھ کر حکم میں جو اہل علم کا متفقہ مسئلہ ہے۔ صحابہ اور تابعین کے عہد سے ہے کہ شرک اکبر و اصغر میں فرق ہے، اس کو قائم رکھا۔ مولانا اسماعیل اس تحقیق میں منفرد ہیں۔ متقدمین میں ہم نے اب تک کسی عالم کے کلام میں اس کے متعلق کوئی اشارہ نہیں دیکھا اور "تقویۃ الایمان" میں "ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ......الخ" کے متعلق جو فائدہ لکھا، اس

میں اس کی تصریح کر دی۔ ہم نے نجدی علماء کو ملاقات سے اس پر متنبہ کیا۔ وہ سن کر حیران رہ گئے۔ پھر کبھی انہوں نے اس پر بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ اس سے ان کے امام کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ وہ مولانا شہید کی بات کا انکار بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارے سامنے انہوں نے اس بات سے انکار نہ کیا اور مولانا شہید کی عظمت کا اعتراف کر لیا۔

ان حالات کے بعد ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہر دو تحریکیں ایک ہیں۔ ہندوستان سے بعض اہل حدیث مکہ معظمہ آتے رہے اور نجدیوں کو یقین دلاتے رہے کہ مولانا اسماعیل شہید ہمارے ہم مسلک ہیں۔ ہم نے جب ان کو مابہ الفرق سمجھایا تو وہ حیران رہ گئے کہ اہل حدیث کیسے ہیں کہ اپنے امام کی باتوں کو بھی نہیں سمجھتے۔ ہم نے کہا یہ اور زیادہ تعجب انگیز ہے کہ وہ کتاب سلیس اردو میں لکھی ہوئی ہے

## ۲۷ امام شوکانیؒ :-

محمد بن علی بن محمد شوکانی ۲۸ ذیقعدہ ۱۱۷۳ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ نے تمام علوم اور ان کی جملہ اجناس، انواع اور اصناف میں تبحر حاصل کیا۔ آپ کو تقریباً شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ نصیب ہوا۔ نیز آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جن کی تعداد ۱۱۴ تک پہنچتی ہے۔ ان میں سے نیل الاوطار نام کی کتاب ایسی ہے جس کی کوئی نظیر نہیں۔ اس میں موصوف نے ہر مسئلے کی داد تحقیق دی ہے اور کہیں انصاف کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ آپ نے دوران بحث میں اپنے آپ کو اسلاف کے مذہب کا سرتاپا مقید نہیں رکھا۔ امام شوکانی کہا کرتے تھے کہ مجھے اپنی تمام تصنیفات میں یہ کتاب سب سے زیادہ پسند ہے اور یہی میرے بلند پایہ اسلوب تحریر کا نمونہ ہے۔ موصوف کے شاگردوں نے بار ہا اس کتاب کو آپ سے پڑھا اور اہل علم نے اس سے استفادہ کیا۔ امام شوکانی نے یہ کتاب اپنے اساتذہ کی زندگی میں لکھی تھی۔ چنانچہ اس میں جو سقم رہ گئے تھے، اساتذہ نے ان کی طرف توجہ دلائی اور ان کی اصلاح کر دی گئی۔ شوکان ایک شہر کا نام ہے۔

امام شوکانی کا انتقال ۱۲۵۰ھ جمادی الآخر میں ہوا۔ (ابجد العلوم صفحہ ۸۸۰)

کتاب "التمہید" میں ہے (مولانا سندھی) فرماتے ہیں۔ میں نے امام محمد بن علی شوکانی کی فقہ امام حسین بن محسن یمنی سے حاصل کی تھی۔ موصوف نے محمد بن ناصر حازمی اور احمد بن محمد بن علی شوکانی سے پڑھا تھا۔ یہ دونوں بزرگ امام شوکانی کے شاگرد تھے۔ میں ایک طویل عرصہ تک امام موصوف کی تصنیفات سے استفادہ کرتا رہا اور مجھے اس کے اعتراف کرنے میں تامل نہیں ہے کہ ان کتابوں کی مدد سے اللہ تعالیٰ نے میرے لیے ارباب تحقیق کے طریقہ کو سمجھنا آسان کر دیا۔ لیکن امام شوکانی کے بہت سے اجتہادی مسائل ایسے ہیں جن سے مجھے اتفاق نہیں۔ بہر حال میں یہ مانتا ہوں کہ وہ منصف مزاج عالم دین ہیں۔ اصول و فروع میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں۔ مذہب زیدی یعنی اور سنت کی ترویج و اشاعت میں کوشاں ہیں۔ لیکن اہل سنت کے فقہا نیز اہل ظاہر کے ساتھ بہت سی باتوں میں اتفاق نہیں کرتے۔ چنانچہ جو شخص امام ولی اللہ اور ان کے پیروؤں کے طریقہ سے واقف ہے، وہ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ ولی اللہی طریقہ کے اہم اور واضح اصولوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اصول ہو یا فروع، ہر دو میں نہ شیعیوں کے امامیہ فرقے سے متفق ہیں اور نہ زیدیوں سے۔ ہم اس امر کی وضاحت کے لئے امام شوکانی کے مسلک اور ولی اللہی طریقہ سے ایک ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

امام شوکانی اپنی کتاب "ارشاد الفحول" میں لکھتے ہیں۔

اجماع کے مسئلہ میں علماء میں اختلاف ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اجماع کا ہونا فی نفسہ ممکن ہے یا اگر اجماع ہو بھی تو اس کے علم کا کہاں تک امکان ہو سکتا ہے۔ پھر اجماع کی روایت ممکن ہے یا نہیں۔ نیز کیا اجماع شرعی حجت کی حیثیت رکھتا ہے؟ جمہور کا تو یہ خیال ہے کہ اجماع شرعی حجت ہے۔ لیکن نظام، شیعیوں کا امامیہ فرقہ اور بعض خوارج اسے شرعی حجت نہیں مانتے۔ اور ظاہر ہے کہ اجماع شرعی حجت تو اس وقت ہی ہو سکتا ہے، جب خود ہماری نظروں کے سامنے اجماع ہو۔ لیکن جب وہ ہمارے سامنے عملی شکل میں نہیں آتا تو وہ کس طرح شرعی حجت بن سکتا

ہے۔ اس کے بعد امام شوکانی اجماع کو شرعی حجت ماننے والوں کے دلائل بیان کرتے ہیں اور ان کا جواب بھی دیتے ہیں۔

آخر میں وہ اس بحث کو یوں ختم کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم ان امور پر غور کرو اور اصل حقیقت کو جاننے کی کوشش کرو تو تم پر حق بات صاف آشکارا ہو جائے گی اور اس میں کوئی شک و شبہ نہ رہے گا۔ فرض کیا اگر ہم اجماع کو شرعی حجت ماننے والوں کا دعویٰ تسلیم بھی کر لیں اور اجماع کے ممکن ہونے اور اس کے علم کے حصول کے امکان کو مان لیں تو پھر بھی اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اجماع کا ہونا حق ہے۔ لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ وہ چیز جس پر اجماع ہوا فی نفسہٖ حق ہے اور اس کا اتباع شرعی لحاظ سے واجب اور ضروری ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ہر مجتہد راہ صواب پر ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہوتے کہ دوسرے مجتہد کے لیے اس مجتہد کے اجتہاد پر عمل کرنا ضروری ہے۔ جب یہ بات تمہارے ذہن نشین ہو گئی تو تم آسانی سے جان لو گے کہ صحیح راہ کون سی ہے۔ اہل علم نے اجماع کے مسئلے میں جو لکھا ہے، اب اسے ہم ذکر کرتے ہیں تاکہ ہماری بات صاف ہو جائے۔"

اجماع کے مسئلے پر مولانا اسمٰعیل شہید اپنی کتاب "اصول فقہ" میں لکھتے ہیں:۔

"اجماع سے احکام ثابت ہوتے ہیں۔ اجماع یا تو بسیط ہوتا ہے۔ بسیط سے یہ مراد ہے کہ ایک امر پر اجماع کرنے والوں کا اتفاق ہو۔ یا اجماع مرکب ہوتا ہے۔ اور مرکب سے مطلب یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ باتوں پر اتفاق ہو۔ لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ ان دو یا دو سے زیادہ باتوں میں ایک نہ ایک چیز مشترک ہو۔ پھر اجماع یا تو حقیقی ہوتا ہے۔ حقیقی ان معنوں میں کہ سب کے سب اپنی زبانوں سے اتفاق رائے کا اظہار کریں۔ اور اگر کوئی خاموش بھی رہے تو یہ خاموشی رضامندی کے مرادف ہو۔ ایک اجماع حکمی ہے، جو اجماع حقیقی کے خلاف ہوتا ہے۔ پھر ایک اجماع قوی ہے۔ قوی سے مراد یہ ہے کہ تمام ماضی اور زمانۂ حاضر کے سب مسلمانوں کو اجماع سے پورا اتفاق ہو۔ ایک متوسط اجماع ہے جو اہل حق کے اتفاق سے عبارت ہے۔ یہ اجماع صرف صحابہ ہی کے زمانہ میں ممکن تھا۔ اس نوع کے

اجماع کی تیسری قسم اجماع ضعیف ہے اور وہ صحابہ کے بعد کا اجماع ہے۔ بہر حال یہ اجماع حقیقی بسیط "خواہ وہ قوی ہو یا متوسط، قطعی درجہ رکھتا ہے۔ اور اس کی حیثیت اثبات اور تعارض کے اعتبار سے "مشہور حدیث" کی سی ہے۔ اس کے علاوہ جو اجماع ہے وہ ظنی اور مشکوک ہے۔"

مولانا سندھی فرماتے ہیں:۔

اگر تم اس کلام کی تفصیل چاہو تو امام ولی اللہ کی کتابوں اور خاص طور پر "ازالۃ الخفاء" کی طرف رجوع کرو۔ گو میرے پاس امام شوکانی کے مسلک اور ولی اللہی طریقہ میں جو لوزاماسی اختلافات ہیں، ان کی بہت سی اور مثالیں بھی موجود ہیں۔ لیکن یہاں میں نے صرف ایک ہی مثال پر اکتفا کیا ہے۔ اور یہ صحیح راہِ عمل کے تعین میں اصولی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ وہ احکام جو اجماع متوسط سے ثابت ہو چکے ہیں، ولی اللہی طریقہ کے نزدیک صحیح راہِ عمل میں داخل ہیں۔ لیکن امام شوکانی ان کو شرعاً حجت نہیں مانتے (کتاب التمہید صفحہ ۶۱)

اب اجماع کے شرعی حجت ہونے پر مدار ہے صدیق اکبر کی خلافت اور مصحف عثمانی کے قبول ہونے کا۔ ہم جدید اصطلاح میں اجماع کے بجائے جمعیت مرکزیہ کا فیصلہ استعمال کرتے ہیں۔ آج جس چیز کو جمعیت مرکزیہ کا فیصلہ کہا جاتا ہے، اسی چیز کو اس زمانے میں اجماع کہتے تھے۔ اس قسم کے فیصلوں کو حجت مانے بغیر کبھی کوئی سیاسی تحریک دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتی، لہٰذا شیعہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر اہل سنت کا مدار ہی سراسر اسی پر ہے۔ الغرض غور کرنے والے پر ہر دو مسلکوں کا فرق زیادہ دیر تک مخفی نہیں رہ سکتا۔

۲۸۔ امام ربانی مجدد الف ثانی:۔

امام ربانی کی دعوتِ تجدید کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے جلال الدین اکبر بادشاہ کے متعلق چند امور کا جاننا ضروری ہے۔ جب ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر ہندوستان سے فرار ہوا تو وہ سیدھا شاہ اسمٰعیل صفوی کے پاس ایران پہنچا اور ایرانی حکومت سے باقاعدہ معاہدہ کر کے

۲۱

کے بعد اس کی مدد سے وہ کھوئے ہوئے تخت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ہمایوں نے منظور کیا تھا کہ میں شیعہ مذہب کو رائج کروں گا اور شیعہ مدبر بیرم خان کو اپنے ساتھ رکھوں گا۔ اکبر نے شیعیت کی بنیاد کاٹنے کے لیے ملی حکومت کی طرح ڈالی۔ اب اس پر نہ کوئی سنی خلیفہ دباؤ ڈال سکتا تھا اور نہ کوئی شیعہ بادشاہ حکم چلا سکتا تھا۔ اکبر جیسا انصاف پسند بادشاہ ہندوستان نے پیدا نہیں کیا۔ اس کے نزدیک قانون کی نظر میں اس کا بیٹا اور دشمن مساوی تھے۔

ہم حرم محترم میں علماء و مشائخ و سلاطین ہر ایک کے لیے فرداً فرداً نام لے کر ختم کلام الٰہی و اذکار وغیرہ کا ثواب ان کی روحوں کو بھیجتے تھے، مگر اکبر کو چھوڑ دیتے تھے۔ ایک روز خواب میں دیکھا کہ ایک چبوترہ ہے جو کافی بلند ہے، مگر ہے سادہ۔ اس پر اکبر تن تنہا کھڑا ہے۔ سامنے دار پر ایک شخص لٹک رہا ہے اور ہم کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ ہم نے اس کی تعبیر یہ کی کہ ہند میں انصاف کرنے والا فقط اکبر ہے، جس نے انصاف کی روح کو قائم رکھا۔ اور ہندو مسلم کو یکساں موقع دیا کہ وہ انصاف سے متمتع ہوں۔ یہ کوئی قاعدہ نہیں کہ مسلمان تو انصاف سے متمتع ہوں اور ہندو بوجہ ہندو ہونے کے رہ جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: - وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَنْ صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَنْ تَعْتَدُوا (مائدہ - ۲) - اور لوگوں کی دشمنی اس وجہ سے کہ انہوں نے تم کو عزت والی مسجد (مسجد الحرام) سے روکا تھا تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو۔ دین الٰہی کا تقاضا یہ ہے کہ انصاف کی روح زندہ رہے۔ اس کا مفاد ایسا حوالہ کرتی ہو۔ اس بلند نشین پر فقط اکبر ہی بیٹھا ہے اور دارالانصاف کی دار ہے۔ جہانگیر نے سونے کی زنجیر کیوں بندھوائی؟ اس کو تو عیاشی سمجھا جاتا ہے۔ وہ اکبر کا بیٹا تھا جو انصاف کو عام کرنے آیا تھا۔

الغرض جب اکبر نے ملکی حکومت قائم کی اور بیرونی اسلامی دنیا سے اس کا تعلق منقطع ہو گیا تو اب اس کے لیے دو صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ مختلف مذاہب کو غیر معتبر قرار دے کر لادینیت

---

[1] حضرت مولانا سندھی نے راقم الحروف سے ایک دفعہ فرمایا۔ اور میں نے سر سید احمد خاں کی روح پر ثواب بھیجنا بھی اپنا معمول بنا رکھا تھا۔

پہ ساری مملکت کو جمع کیا جاتا ہے جس کا تجربہ اب یورپ میں ہو رہا ہے۔ مگر اکبر نے یہ احتمال قریب بھی نہ پھٹکنے دیا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ مختلف مذاہب کو تسلیم کر کے ہر ایک کو پوری آزادی دی جائے اور قانون حکومت کی جو شخص خلاف ورزی کرے اس سے مواخذہ ہو خواہ وہ ہندو ہو یا مسلم۔ دوسرے لفظوں میں مذہب آزاد ہے۔ جب تک کہ حکومت سے اس کا تصادم نہ ہو۔ یہ اکبر کا بنایا ہوا قانون ہے جس پر انگریز اب عمل کر رہے ہیں۔ اور اپنے آپ کو بڑا عالی دماغ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس ملک میں جو مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے۔ حکومت چلانے والے بادشاہ اور اس کی انتظامی کونسل کا کیا طرز عمل ہوگا؟ اس کے لیے اکبر نے دین الٰہی کا فقرہ ایجاد کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اور اس کی مرکزی کونسل کسی خاص مذہب کے طرفدار نہیں ہوں گے۔ مگر وہ مطلق مذہب کی پابندی سے بھی اپنے آپ کو آزاد نہیں کریں گے۔ اور لامذہبیت نہیں آنے پائے گی۔ یعنی وہ خدا کی حکومت تسلیم کریں گے۔ اب ایک ہندو اللہ کی حکومت کی تفسیر ایک طرح کرتا ہے۔ ایک سنی مسلمان دوسری طرح اور ایک شیعہ تیسری طرح۔ ان اختلافات سے حکومت کو تعرض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا۔ البتہ پرائیویٹ طور پر بادشاہ اور ارکان کونسل اپنے اپنے مذہب کے پابند ہوں گے۔ اس یکسانی کو دین الٰہی سے تعبیر کیا گیا۔ اس وسیع مملکت کے لیے اس سے بہتر غیر اسلامی نظام ناممکن تھا۔

ہماری رائے میں جو کام اکبر نے شروع کیا، وہ اساساً صحیح تھا۔ عملاً اس میں غلطیاں ایسی ہوئیں کہ اس عظیم الشان کام کو چلانے کے لیے اسے آدمی میسر نہیں آئے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کوتاہی خدا تعالیٰ نے شاہ ولی اللہ کے ذریعے پوری کردی۔ شاہ صاحب نے اس کام کو مکمل کر دیا جو اکبر نے شروع کیا تھا۔ شاہ ولی اللہ اول تو اسلام کی اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ وہ انسانیت کا مصداق ہو جاتا ہے۔ پھر وہ مختلف ادیان کو آپس میں یوں مطابقت دیتے ہیں کہ

ان میں تناقض نہیں رہتا۔ اگر ہندوستان شاہ صاحب کے طریقے کا علم پڑھنے کے بعد نظام حکومت چلانے کا ارادہ کرے، تو اس کے مقابلے میں کوئی اجنبی حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی خواہ وہ کافر ہو یا مسلم۔

شاہ صاحب کی حکمت پڑھنے کے بعد اگر کوئی شخص اسلامی ممالک کی سیر کرے تو اس کے سامنے یہ بات آجائے گی کہ وہ ملک اپنے فقہی مذہب چلانے کی صلاحیت تو رکھتے ہیں لیکن اگر مختلف مذاہب کو وہ اپنے یہاں اجازت دیں یا اجازت دینے پر مجبور کر دیئے جائیں تو سوائے لادینیت کے اور کوئی نظام حکومت ان کے یہاں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ترکی میں جا کر دیکھ لو۔ پھر دیکھو کہ کس طرح عرب ممالک اور افغانستان ترکی کا تتبع کر رہے ہیں۔ اب اسلامی ممالک کی یہ حالت ہے کہ وہاں یا اکبر کا دین الٰہی ہے یا لادینیت۔ اگر شاہ صاحب کی حکمت کا رواج ہوتا تو وہ ممالک اس مرض میں مبتلا نہ ہوتے۔

اکبر کے کارکنوں نے جو غلطیاں کیں اور جس طرح وہ اسلامی حدود سے باہر نکلے ان کی اصلاح کا ابتدائی کام حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی نے شروع کیا اور وہ مجدد مانے گئے۔ مگر امام ربانی نے جو کام شروع کیا تھا۔ اس کی تکمیل محمد شاہ کے عہد میں شاہ ولی اللہ نے کی۔ شاہ صاحب کو کام کرنے کا اس وقت موقع ملا جب دلی کی سلطنت اصل معنوں میں مسلمانوں کے ہاتھ سے جا چکی تھی۔ اس لئے اس تعلیم کے نتائج اس وقت ظاہر نہ ہو سکے۔

الغرض اکبر کے کارکنوں کی بعض غلطیوں کی اصلاح کے سلسلے میں امام ربانی نے جو کام شروع کیا تھا امام ولی اللہ نے اسے مکمل کر دیا۔ چنانچہ امام ربانی کو شاہ صاحب اپنے طریق کا امام مانتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ سے استبعاداً ذکر کیا کہ شاہ صاحب حضرت مجدد کو امام کہتے ہیں۔ تو حضرت نے فرمایا۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ یعنی حضرت مجدد بہت بڑی ہستی ہیں۔ اس لئے شاہ صاحب کا یہ لکھنا خود شاہ صاحب کے حق میں، یعنی ان کی عظمت ثابت کرنے کے لئے بہت بڑی چیز ہے۔ حضرت کا جواب میرے اس وہم کو دور کرنے

سکتے ہیں کہ شاہ صاحب نے مجدد صاحب کو "امام" کہہ کر میرے نزدیک خلاف معمول بات فرمائی تھی۔

حضرت شاہ صاحب مکتوبات میں فرماتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام پر ایک ہزار برس گزرنے کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں بعض اعتبارات سے پہلے فیوض مثلاً قلب و روح اور ان کے متعلقہ احوال اجمالی صورت میں ظاہر ہوئے۔ اور بعض اعتبارات سے پہلے فیوض مفصل طور پر رونما ہوئے۔ مثلاً اس دور میں "تجرید" اور "انائیت کبریٰ" کے مسائل پہلے دوروں کے مقابلے میں بڑی تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں۔ الغرض اس دور کے "امام" شیخ مجدد ہیں۔ اس دور کے بہت سے مخصوص معارف شیخ موصوف نے دنیا میں بیان فرمائے۔ وہ اس دور کے قطب ارشاد ہیں اور ان کے مبارک ہاتھوں سے بہت سی گمراہیاں اور بدعتیں دور ہوئیں۔ فقیر، شیخ مجدد کے بہت سے معارف کا جو موصوف اسی دور کے فاتح کی حیثیت سے ارشاد فرما چکے ہیں، مصداق ہے

(صفحہ ۹۰۸)

غرضیکہ امام ربانی شاہ ولی اللہ کے طریقے کے "امام" ہیں اور اسی روشنی میں ہم امام تبلیغ کے اس ارشاد کو نقل کرتے ہیں۔ "مجھے ایک عظیم کارخانہ حوالے کیا گیا اور مجھے پیری و مریدی کے لیے نہیں متعین کیا گیا۔ میری تخلیق کا مقصد خلقت کی محض تکمیل و ارشاد نہیں بلکہ کوئی اور معاملہ مقصود ہے۔ اور کوئی دوسرا کارخانہ مطلوب۔" (مکتوب ششم دفتر دوم)۔ فسانہ طرازوں اور قصہ گو حضرات نے ان تصریحات کو دوسرے ادنیٰ محامل پر محمول کر لیا تھا۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

مذکورہ بالا عبارت صاف طور پر اس امر کی صراحت کرتی ہے کہ امام ربانی اس دور کے "امام" ہیں۔ "تفہیمات الٰہیہ" میں بیان کیا گیا ہے کہ اس دور کے قیم امام ولی اللہ ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"ہم سے پہلے جو بزرگ گزرے ہیں وہ وحدت الوجود کے مراتب میں بہت آگے بڑھ گئے اور ان کا

علم اس منزل پر پہنچا کہ سب کچھ اللہ ہی اللہ ہے۔ اس پر ملاء اعلیٰ میں وجود حقیقی اور مخلوقات میں جو اتحاد اور اختلاف ہے، اس کا علم متشکل ہوا۔ شیخ مجدد آئے اور اس علم کے اردگرد جو فائق میں متقدر ہو چکا تھا، گھومتے رہے۔ کبھی تو انہوں نے یہ فرمایا کہ عالم موجود فی الخارج ہے۔ کبھی یہ فرمایا کہ عالم موہوم ہے۔ کبھی ارشاد کیا کہ عالم اسمائے الٰہی کا پرتو ہے لیکن اس مسئلے کی انہوں نے صراحت نہ فرمائی۔ آخرکار اس دور کا قیم آیا اور اس میں جو حقیقت تھی۔ وہ کھول کر بیان کردی۔ (ص ۱۰۰ و ص ۱۰۲)

شاہ ولی اللہ نے امام ربانی کے بعض بیانات کی، جن سے اغلاق کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں، اس طرح وضاحت بھی کی کہ امام ربانی کا حقیقی مقصود واشگاف ہو گیا۔ امام ربانی کے بعض اقوال پر عرب و ہندوستان میں بڑے اعتراض ہوتے تھے۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "درجۂ خلت" میرے ذریعہ نصیب ہوا۔ شاہ ولی اللہ اس کی توجیہ فرماتے ہیں کہ یہ بیان کی پیچیدگی، الفاظ کی کوتاہی اور عدم مساعدت ہے۔ ورنہ ان کا مطلب صحیح ہے اور اس میں کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان کو فتح کیا اور یہاں اسلامی سلطنت قائم کی۔ گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا ممالک اور ادیان پر غلبہ آپ کے خلق کمالات میں داخل ہے، مگر ہندوستان پر غلبہ متحقق ہونے میں سلطان محمود واسطہ بنتے ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض کمالات کی تشریح میں امام ربانی واسطہ بنے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ امام ربانی کے بیانات میں الفاظ کی ایک گونہ تنگی ہے۔ (تفصیل ملاحظہ ہو مکتوبات صفحہ ۱۸۰)

## ۴۷۔ سید احمد شہید کی تعلیم و تربیت :۔

امام عبدالعزیز کے خواص اصحاب جن کے رگ و ریشہ میں حزب ولی اللہ کی خصوصیات سرایت کر چکی تھیں اور ایک لمبے زمانے سے ان کی تربیت پر توجہ مرکوز رہی تھی۔ یہ شاہ عبدالعزیز کے تین بھائیوں کے علاوہ شاہ اسمٰعیل، مولانا عبدالحی، مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب تھے۔ امیر شہید

دراصل اس حزب میں سے نہیں تھے بلکہ بعد میں ان کے ساتھ منضم کئے گئے تھے۔ ان میں کشفی کمالات تھے۔ سپاہ گری کی تعلیم بھی۔ سید تھے۔ اس لئے ان کو امام عبدالعزیز نے امارت جہاد کے لیے موزوں قرار دیا۔ مگر اس خیال سے کہ کہیں جذب مذکور کی راہ سے نہ بھٹک جائیں ان کے ساتھ دو وزیر اپنے مکمل تربیت یافتہ لگا دیئے۔ مگر اپنا صحیح اور پورے معنوں میں جانشین حضرت شاہ محمد اسحاق کو مقرر کیا۔

سید احمد شہید صاحب کی تعلیم کے متعلق کہتے ہیں کہ جب وہ کتاب دیکھتے تھے تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ عربی کتاب دیکھنے سے زائد چیز کے دیکھنے سے ان کی بصیرت روک دی گئی تھی۔ اس کا دراصل یہ مطلب تھا کہ شاہ ولی اللہ کے طریقے کا صاحب کشف اس سے زیادہ کتابی علوم کا محتاج نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک سید صاحب دینی علوم کی جس قدر کہ ایک امیر کے لیے ضروری ہے، تحصیل کر چکے تھے۔ ان کی نفی دینی تعلیم کشف سے ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن یہاں سید صاحب کو امی ثابت کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ نیز یہ غلط ہے کہ شاہ محمد اسحاق کے اشارے پر مولانا عبدالحی ان سے ملے اور بیعت کی اور اس کے بعد مولانا عبدالحی کے کہنے پر مولانا اسمٰعیل نے بھی بیعت کر لی۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ پڑھنے سے امیر شہید کی طبیعت پر بوجھ پڑتا تھا اور کشف علمی پر یہ چیز گراں گزرتی تھی۔ اس لیے ان کو غور کے مطالعے کے لیے مکلف کیا گیا۔ اس طرح ان کو جس قدر دینی علوم کی ضرورت تھی انہوں نے حاصل کر لیے۔ گو وہ تحصیل عالمانہ طریقے پر نہ تھی جیسا اس کا تجربہ مدرسے کے اچھے بعض دوسرے مشائخ کے سلسلے میں ہوا ہے۔ وہ عربی فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ قرآن شریف کا ترجمہ اور حدیث کی کتابیں وہ سنتے اور جو عالم انہیں سناتا وہ ان سے بدرجہا زیادہ علم رکھتا تھا مگر جس وقت وہ کسی شرعی مسئلے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تحقیق جان لیتے تو جس طرح وہ پوری جماعت میں انقلاب پیدا کر دیتے تھے، اس کا عشر عشیر بھی وہ عالم پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح ہم سید احمد شہید صاحب کو ایک عالم مانتے ہیں۔ ان کے مناقب

لکھنے والے دھوکہ دیتے ہیں کہ وہ پڑھے لکھے نہ تھے بلکہ سب چیزیں کشف سے ان کو حاصل تھیں۔
ان لوگوں کی خواہش دراصل یہ ہے کہ سید صاحب کا جو تعلق تلمذ شاہ عبدالعزیز سے ہے وہ کاٹ دیا جائے۔ اور وہ ایک ملہم مہدی کے طور پر مانے جائیں۔ ان لوگوں نے اس تحریک کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

شاہ علم اللہ حسنی کا تذکرہ پہلے آچکا ہے ان کے فرزند سید محمد ضیاء اور ان کے بیٹے سید شاہ ابو سعید ہیں۔ آپ امیر شہید کے جد مادری اور امام ولی اللہ کے خلیفہ ہیں۔ سیرت احمدیہ صفحہ ۵۶ میں ہے۔ اس خاندان کے بہت سے بزرگوں نے شاہ ولی اللہ اور آپ کے صاحبزادوں سے ظاہری اور باطنی استفادہ کیا۔ شاہ ابو سعید، شاہ محمد واضح، سید محمد صابر، سید محمد نعمان، عم امیر شہید نے شاہ ولی اللہ سے اور سید قطب الہدیٰ، سید محمد اسحاق برادر اکبر امیر شہید نے شاہ عبدالعزیز سے اور شاہ عبدالقادر سے استفادہ کیا۔ اس طرح اس خاندان میں حضرت مجدد سرہندی اور مجدد دہلوی کی برکتیں جمع ہو گئیں۔ یہ خاندان اپنا خصوصی مشرب اور مخصوص فکر رکھتا ہے۔ یہ خصوصیت امیر شہید کے خاندان میں حضرت مجدد کے خلیفہ شیخ آدم بنوری سے متوارث چلی آتی ہے۔ بنا بریں سید امیر شہید کا حزب ولی اللہ کے رنگ میں پوری طرح سے رنگا جانا بعید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہیں فتح ملی تو انہوں نے اپنے امیر المومنین ہونے کا اعلان کر دیا اور تحریک ناکام رہ گئی۔

مشرقی و مغربی ہند کی رقابت تاریخ میں قدیم سے چلی آتی ہے۔ چندر بنسی سورج بنسی خاندان اسی مغربیت و مشرقیت کے دوسرے عنوان ہیں۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ رقابت مذکورہ بعد از اسلام بھی قائم رہی اور امیر شہید کے وقت بھی وہ بروئے کار آئی۔ امیر شہید مشرقی ہند رائے بریلی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے عام مریدین بھی بہار وغیرہ کے تھے۔ اس کے بالمقابل مغربی ہند دہلی ہے۔ یہ لوگ دہلی تحریک کو اپنانا چاہتے تھے۔ اسی لئے مولانا ولایت علی بہاری نے مولانا محمد اسحٰق کے خلاف دوسری جماعت بنا لی۔ وہ مولانا محمد اسحٰق اور حزب دہلی کو اس میدان سے دور ہٹانا چاہتے تھے۔

## ۳: ہیئتِ اجتماعیہ کے مدارج :-

ایک شخص اپنے طبعی جذبات اور علوم کے متعلق اپنی ضروریات اور جسمانی حاجتیں تنہا کبھی پوری نہیں کر سکتا۔ جس جماعت میں یہ صلاحیت ہو کہ اس کا ہر فرد اپنی تمام ضرورتوں کو پورا کر سکے اس کو ہیئتِ اجتماعیہ کہا جاتا ہے۔ یہ انسانی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔ اس ہیئتِ اجتماعیہ کو قائم رکھنے کے لیے یہی لوگ اپنی حکومت بنا لیتے ہیں۔ حکومت بن جانے کے بعد افراد کی بغاوت ہیئتِ اجتماعیہ کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ اچھی حکومت پیدا کر لینا ہیئتِ اجتماعیہ کے بعد انسانیت کی ترقی کا دوسرا قدم ہے۔ جس جگہ یہ دونوں چیزیں جمع ہوں، وہ مدینہ کاملہ ہے۔ جہاں نقص ہیئتِ اجتماعیہ ہو اور منظم حکومت نہ ہو اس کو مدینۂ ناقصہ کہتے ہیں اور آج کل کی اصطلاح میں اسے سوسائٹی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

انارکسٹ سوسائٹی کو مانتے ہیں اور اسی پر انسانی ترقی کو ختم کر دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ سوسائٹی ہی نپٹے اور بخود حکومت کر سکتی ہے۔ "مدن ناقصہ" شاہ صاحب کے نزدیک مذکورہ بالا ہیئت اجتماعیہ کا ایک عنوان ہے۔ چھوٹے گاؤں میں تو ہیئت اجتماعیہ ہی حاکم ہوتی ہے۔ جیسے ایک بڑے گاؤں میں ہیئت اجتماعیہ حاکم ہے، اسی طرح بعض بڑے گاؤں ہوتے ہیں، جن میں کئی کئی آدمی نمبردار اور چودھری ہیں۔ اصلی طریقے کے مطابق وہاں ایک چھوٹی سی حکومت ہونی چاہیے مگر بعض اوقات حکومت کے بغیر بھی وہ لوگ اپنے توافق سے کام چلا لیتے ہیں۔ پرانے راجپوتوں اور آج کے افغانوں میں پنچایت اور جرگے کی رسم اسی توافق کی مثالیں ہیں۔

بعض بڑے شہر ہیں، جہاں حکومت کے بغیر کوئی کام چل ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ وہاں کی عقلمند اور نمایاں شخصیتیں سب ایک جگہ جمع ہو جاتی ہیں۔ عموماً اس اجتماع کا کوئی مقدم مقرر ہوتا ہے۔ بحث کرنے کے بعد وہ ایک رائے قائم کر کے اٹھتے ہیں۔ یہ پارلیمنٹ ہے اور ہماری زبان میں اس کا نام اہل حل و عقد ہے۔ ہمارے ہاں کے متاخرین بادشاہوں نے اہل حل و عقد کی قوت کو برباد کر کے اپنی شخصیت کو نمایاں کیا اور اس طرح خود برباد ہو گئے۔ جب تک مصلح بادشاہ

رہے۔ جن میں کہ بادشاہی چلانے کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ تو وہ اہل حل و عقد کے مشوروں کے پابند رہتے تھے۔ ہمارے خیال میں یورپ نے پارلیمنٹری نظام کی کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی بلکہ وہ اسی نظام کا منضبط طریقہ ہے۔ ہمارے یہاں یہ چیز منضبط نہیں تھی۔

دو آدمی مساوی درجے کے مل کر حکومت کرتے ہیں۔ جب وہ کسی مشورے میں مل بیٹھتے ہیں، تو جیسے سفر کے رفیق ایک شخص کو وقتی طور پر امیر بنا لیتے ہیں، اسی طرح اس اجلاس میں ایک وقتی امیر بنا لیا جاتا ہے اور باہم اتفاق سے کام چلتا رہتا ہے۔ اس کی مثالیں بھی بڑے شہروں اور علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ انسانیت کے طبعی تقاضوں میں سے ایک شق ہے۔ یعنی کبھی وہ ایسا بھی کر لیتے ہیں۔ جمعیۃ مرکزیہ میں عموماً بورڈ کی روح کام کرتی ہے۔ کیونکہ وہاں سب یکساں ہوتے ہیں، کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہوتا۔

۱۲۔ سکھ :-

۱۷۶۱ء کے دوران میں سکھوں نے پنجاب میں بہت زیادہ اودھم مچایا اور دہلی پر آفت لانے کا ارادہ کیا، مگر اس وقت پھر شاہ ابدالی نے نجیب الدولہ کی امداد کی۔ سکھوں نے سارے ملک میں غدر مچا رکھا تھا۔ اپریل ۱۷۶۲ء میں وہ لاہور آیا۔ سکھ بھاگ کر پہاڑوں میں چلے گئے۔ آلا جاٹ نے سرہند میں دو لاکھ فوج جمع کر رکھی تھی۔ شاہ ابدالی نے تیس کوس دو روز میں طے کرکے اس پر حملہ کیا اور شکست دی، جس میں سکھوں کے بیس ہزار آدمی قتل ہوئے۔ اس کے بعد وہ کبھی ہندوستان نہیں آیا۔ (تاریخ ذکاء اللہ ۱۴۲/۹)

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کے یہ اشعار جو آپ نے اپنے چچا شاہ اہل اللہ کے نام لکھ کر روانہ کئے، سکھوں کے پیدا کردہ اضطراب کا صحیح نقشہ پیش کرتے ہیں۔

جزى الله عنا قوم سكه ومرهته — عقوبة شر ما ملا فيه أجليه

وقد قتلوا جمعا كثيرا من الورى — وقد أدخلوا في أهل مصر زلازلي

نهبوا عامر معمورة في بلادنا — فجوفوا بنيانا بنقض والاماثل

## ۳۴۔ مولانا محمد یعقوب دہلوی

آپ شاہ محمد اسحاق کے بھائی ہیں۔ آپ کا سن پیدائش نامعلوم ہے۔ امام ولی اللہ کو شاہ محمد اسحاق اور شاہ یعقوب کی ولادت اور حجاز کی طرف ہجرت کرنے کی بشارت دی گئی تھی۔ شیخ محمد عاشق "قول جلی" میں لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے فرمایا کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ سب کے سب فرزند جو لطائف الٰہی سے مجھے عطا ہوئے ہیں، نیک بخت ہیں اور ان میں ایک بات کی اور نیکی ظہور پذیر ہوگی۔ لیکن تدبیر غیبی کا تقاضا یہ ہے کہ دو شخص اور پیدا ہوں گے جو مکہ اور مدینہ میں دینی علوم کو ترویج کریں گے اور وہیں سکونت پذیر ہو جائیں گے۔ یہ اپنی ماں کے رشتہ سے مجھ سے متعلق ہوں گے۔ گو آدمی کو فطرتاً اپنے وطن مادری سے محبت ہوتی ہے۔ اور جہاں والدہ متوطن ہوں اسے چھوڑنا بڑا گراں گزرتا ہے۔ لیکن بعد مجبوری یہ بھی کرنا پڑتا ہے۔"

نواب صدیق حسن خاں "قول جلی" کی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ کی اس عبارت کے مصداق شاہ عبدالعزیز کے دونوں نواسے مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب ہی ہو سکتے ہیں۔ ان دونوں نے دہلی سے ہجرت کی۔ مکہ میں اقامت پذیر ہوئے۔ وہاں سالہا سال تک علم حدیث کا درس دیا۔ اور عرب و عجم ان سے فیض یاب ہوئے۔

میرے نزدیک "احیائے علوم" سے مراد صرف حدیث کی روایت نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ یہ دونوں بزرگ امر بالمعروف و نہی عن المنکر، دعوت جہاد اور اعلائے کلمۃ اللہ میں مصروف کار رہے اور یہی مقصد ہے احیائے علوم کا۔ شیخ محمد یعقوب نے اپنے نانا امام عبدالعزیز اور ان کے گرامی قدر ساتھیوں اور خاص طور پر شاہ محمد اسحاق سے علم حاصل کیا تھا۔ [illegible] موصوف سے شیخ مظفر حسین کاندھلوی، امیر امداد اللہ، شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نے جو دیوبندی جماعت کے بانیوں میں تھے، اکتساب علم کیا۔ شیخ محمد یعقوب کا انتقال ۲۹ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ میں ہوا اور مدرسہ دیوبند کی بنیاد ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ میں پڑی۔ اس دن سے قریب

دہلوی کا نام دیوبندی جماعت مشہور ہوا (التمہید ص۲۱۳)

امام عبدالعزیز کے انتقال کے بعد حزب دہلوی کی امامت مولانا محمد اسحاق کے سپرد ہوئی ۱۲۶۲ھ میں موصوف کا انتقال ہوا تو مولانا محمد یعقوب دہلوی ان کے جانشین ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز سے منقول ہے کہ وہ کہا کرتے تھے۔

الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسمٰعیل و اسحاق۔ خدا کا شکر ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحاق عطا فرمائے۔

## ۲۴ مولانا مملوک علی :-

مولانا مملوک علی کے آباؤ اجداد میں سے ایک شیخ محمد ہاشم ہیں جن کا سلسلۂ نسب قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ شاہجہاں نے آپ کو قصبۂ نانوتہ میں جاگیر دی تھی۔ یہ لوگ وہیں بس گئے۔ ان کی اولاد سے بڑے بڑے عالم پیدا ہوئے جو حزب دہلوی کے نامی گرامی ارکان تھے۔

ان میں ایک مولانا استاذ محمد مملوک علی بن احمد علی بن غلام شرف بن عبداللہ بن فتح بن محمد مفتی بن عبدالسمیع بن شیخ محمد ہاشم ہیں۔ شیخ موصوف شیخ رشید الدین کے شاگرد ہیں۔ آپ علوم فقہ اور دوسرے علوم و فنون میں اپنے زمانے کے علماء سے ممتاز اور فائق تھے۔ دہلی کالج میں اپنے استاد مولانا رشید الدین کے بعد ان کو مدرسی کا منصب سپرد کیا گیا۔ ان کے شاگردوں میں سے مولانا محمد مظہر نانوتوی، شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، عبدالرحمٰن پانی پتی، احمد علی سہارنپوری کا مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ محمد یعقوب ابن مملوک علی اور ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ تھے۔ سید احمد دہلوی بانی جامعہ علی گڑھ، نذیر احمد مترجم قرآن اور مولوی ذکاء اللہ اور دوسرے نامور اہل علم کو بھی ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔

سرسید اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں لکھتے ہیں۔

"جناب مولوی مملوک علی شاگرد مولوی رشید الدین خاں علم معقول و منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو ان کتابوں سے گنجینۂ عالم خالی ہو جائے

قرآن کے لوح حافظہ سے پھر ان کی نقل ممکن ہے۔ چودہ پندرہ سال سے مدرسہ شاہجہاں آباد میں عہدہ مدرسی رکھتے تھے۔ لیکن اب کئی سال سے سرگروہ مدرسین ہیں۔"

مولانا مملوک علی نے ۱۲۶۷ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ کو مقبرہ امام ولی اللہ دہلوی میں دفن کیا گیا۔ آپ کے صاحبزادے شیخ محمد یعقوب مدرسہ دیوبند کے رئیس المدرسین مقرر ہوئے تھے اور ان ہی سے ہمارے استاد شیخ الہند نے علم حاصل کیا۔ (از التمہید)

مولانا مملوک علی سرکاری ملازمت کے ملازم تھے۔ ان کی نگرانی میں حزب دہلوی کا کام شبہات سے بالا رہ کر چل سکتا تھا، ورنہ ریذیڈنٹ کی نظر نہایت تیز تھی، مگر مولانا مملوک علی کو آزاد ساتھی جیسے امیر امداد اللہ۔ شاہ اسحاق کے مدرسے کے پرانے طالب علم اور ان کے داماد مولوی نصیر الدین کے شاگرد تھے۔ موصوف کی طبیعت عالمانہ رنگ کی نہ تھی۔ وہ امیر شہید سے ملتی جلتی طبیعت رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ سید صاحب شہید کا نمونہ تھے۔ مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی ان کے ساتھ اس طرح کام کرتے رہے جیسے امیر شہید کے ساتھ مولانا عبدالحی اور مولانا اسماعیل تھے۔

## ۲۳۔ مولانا قطب الدین دہلوی۔

آپ شاہ محمد اسحاق صاحب کے خلیفہ ہیں۔ موصوف نے شرح المشکوٰۃ لکھی جس سے لوگوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ اس کے علاوہ آپ کی اور کتابیں بھی ہیں۔ مولانا قطب الدین شاہ محمد اسحاق کے مخصوص اصحاب میں سے تھے۔ موصوف نے ۱۲۸۹ھ میں مدینہ منورہ میں انتقال فرمایا۔

## ۲۴۔ مولانا مظفر حسین کاندھلوی:

آپ بڑے پرہیزگار، خدا ترس، نیکیوں کا حکم دینے والے اور برائیوں سے روکنے والے تھے۔ موصوف نے اپنے چچا مفتی الٰہی بخش اور مولانا اسحاق سے پڑھا اور مولانا محمد یعقوب دہلوی کی صحبت میں فیض رشد پایا۔ آپ مولانا محمد اسحاق کے حجاز تشریف لے جانے کے بعد ہندوستان میں

آپ کے نائب تھے۔ آپ ہی ہیں جنہوں نے شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم دیوبندی کو منبر وعظ پر بٹھایا۔ مولانا موصوف کا ۱۰ محرم ۱۲۹۳ھ میں انتقال ہوا اور بقیع میں دفن ہوئے۔ (التمہید)

## سنہ ۱۲۸۳ھ تاسیس مدرسہ دیوبند

حزب ولی اللہ کے مشائخ نے جو ۱۲۷۵ھ اور اس سے پہلے ہجرت کر کے حجاز تشریف لے گئے تھے، فیصلہ کیا کہ مدرسہ دہلی کے نمونے پر دینی علوم کے لئے ایک درسگاہ قائم کی جائے۔ مدرسہ دہلی امام عبدالعزیز کے زمانے میں بنا تھا اور اس کے اساتذہ میں سے مولانا عبدالحی دہلوی، پھر رشیدالدین دہلوی اور ان کے بعد مولانا مملوک علی دہلوی تھے۔ یہ مدرسہ ۱۸۵۷ء یعنی ۱۲۷۳ھ کے ہنگامہ میں بند ہو گیا تھا۔

امیر امداد اللہ، امام عبدالغنی دہلوی اور حزب دہلی کے دوسرے مشائخ چاہتے تھے کہ حجاز میں ہندوستان کے اسلامی مرکز کو مضبوط بنائیں اور سرحد کے پہاڑوں میں ہندوستانی تحریک کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے کوئی اقدام کریں۔ ہندوستان میں امیر امداد اللہ کے نائب شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم تھے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے ایک دفعہ ارشاد فرمایا تھا: "اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو ایک لسان (ترجمان) عطا فرماتے ہیں، چنانچہ شمس تبریزی کے واسطے مولانا رومی کو لسان بنایا اور مجھ کو مولانا محمد قاسم لسان عطا ہوئے۔ جو میرے قلب میں آتا ہے مولانا اس کو بیان کر دیتے ہیں۔" مولانا حسین احمد مدنی نے ایک مرتبہ حاجی امداد اللہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ فرماتے تھے: "مولانا محمود حسن کو کم نہ سمجھو، وہ اپنے زمانے کا شیخ ہو گا۔" (التمہید)

## حاجی مولانا امداد اللہ

آپ بہت بڑے عارف، شریعت اور طریقت کے جامع اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے جہاد کرنے والے تھے۔ امیر امداد اللہ فاروقی ہیں۔ آپ کی پیدائش ۱۲۳۳ھ بمقام نانوتہ ہوئی۔ آپ

شیخ محمد تھانوی، شیخ الٰہی بخش کاندھلوی اور شیخ نصیر الدین دہلوی سے پڑھا۔ جب بالاکوٹ کے مقام پر سید احمد شہید شہادت پا گئے تو جماعت کے باقی ماندہ لوگوں نے مولانا نصیر الدین دہلوی کی بیعت کر لی۔ اس موقع پر امیر امداد اللہ نے بھی پہلے ان کی بیعت کی تھی۔ ۱۲۶۱ھ میں امیر امداد اللہ حرمین گئے۔ یہاں مولانا محمد اسحاق صاحب سے ملے اور ان سے دعوت و ارشاد کا طریقہ اخذ کیا۔ بعد ازاں ۱۲۶۲ھ میں آپ پھر ہندوستان چلے آئے۔ امیر امداد اللہ صاحب کا اصل نام امداد حسین تھا، جسے مولانا اسحاق صاحب نے بدل کر امداد اللہ کر دیا۔ حاجی امیر امداد اللہ صاحب کی ذات مرجع خلائق تھی اور آپ سے بے شمار اہل فن نے فیض پایا۔ ان میں سے مشہور مولانا محمد قاسم، رشید احمد، شیخ فیض الحسن سہارنپوری اور دوسرے نامی گرامی علمائے ہند ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں آپ معرکہ شاملی کے امیر تھے اس کے بعد موصوف چھپ کر جانب حجاز چلے گئے اور مکہ مکرمہ میں اقامت پذیر ہو گئے۔ حاجی امداد اللہ دیوبندی جماعت کے امیر تھے۔ آپ نے ۱۳۱۷ھ میں انتقال فرمایا۔ (تمہید)

## ۳۸۔ مولانا محمد قاسم

ابو ہاشم محمد قاسم بن اسد علی بن غلام شاہ بن محمد علاء الدین بن محمد فتح بن محمد مفتی بن عبد السمیع بن محمد ہاشم نانوتوی۔ آپ ۱۲۴۸ھ میں پیدا ہوئے۔ موصوف نے اپنے چچا مولانا مملوک علی سے اور ان کے علاوہ مولانا عبد الغنی، مولانا احمد علی اور حاجی امداد اللہ وغیرہم سے اکتساب علم کیا۔ ۱۲۸۲ھ میں آپ کے ہاتھوں دار العلوم دیوبند کی بنیاد پڑی۔ اس کے کوئی نو برس بعد ۱۲۹۲ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ کالج کا بھی افتتاح ہوا۔ مولانا محمد قاسم چودھویں صدی ہجری کے مجددین میں سے تھے۔ آپ نے ولی اللّٰہی حکمت و معارف کو اہل ہند کے لئے زمانہ حاضر کے لباس میں پیش کیا۔ موصوف سے بے شمار لوگوں نے فیض علم پایا تھا اور ان میں سے ایک ہمارے استاد حضرت شیخ الہند ہیں جو آگے چل کر دیوبندی تحریک کے میرے دور کے امام اور پیشوا بنے۔ مولانا محمد قاسم کی دعوت کا سارا انحصار امراء اور اصحاب ثروت کے بجائے اللہ تعالیٰ کے بھروسے سے تھا

کے غریب طبقوں پر تھا۔ چنانچہ دیوبندی تحریک حنفی اور وسیع طبقہ امراء کے ساتھ خلط ملط کرنے سے بچتی تھی۔ مولانا محمد قاسم نے ۱۲۹۷ھ میں انتقال فرمایا۔ آپ ؒ کی شخصیت مولانا اسماعیل شہید سے بہت مشابہ تھی۔

## ۳۹۔ مولانا رشید احمد گنگوہی:

شیخ الاسلام ابو مسعود رشید احمد گنگوہی ہدایت اللہ انصاری کے صاحبزادے ہیں۔ آپ ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اور مولانا مملوک علی، مولانا عبدالغنی، مولانا احمد سعید اور مولانا امداد اللہ مہاجر مکی سے آپ نے تعلیم پائی۔ خود میں (مولانا سندھی) نے موصوف سے سنن ابوداؤد کا ایک بڑا حصہ پڑھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے بڑا نفع دیا۔ مولانا رشید احمد کی صحبت کا اثر ہے کہ میں ان کے مسلک پہ اس طرح کاربند ہوا کہ مجھے اس سے ہٹنے کا کبھی خیال نہیں ہوا۔ ان کی بدولت فقہ اور حدیث کے مطالعے میں ولی اللہی طریقہ میرے سامنے واشگاف ہو گیا اور میں ان کی برکت سے فقہ، سلوک، معرفت، عربی زبان اور کتاب وسنت کے علوم میں اصول و معقول کو خوب پہچان گیا۔ میں نے مولانا رشید احمد کو فقہ حنفی کا ایک راسخ القدم امام و مجتہد پایا۔ آپ اپنے استاد مولانا عبدالغنی کے طریقہ فکر کے بڑی سختی سے پابند تھے۔ اور اس راہ میں پہاڑ کی طرح غیر متزلزل تھے۔ آپ ولی اللہی مسلک میں مولانا محمد اسحاق سے بہت مشابہ ہیں۔ میں آپ کی کتاب "براہین قاطعہ" سے سنت اور بدعت کی حقیقت سمجھا۔ یہ کتاب موصوف نے شاہ اسمٰعیل شہید کی تصنیف "ایضاح الحق" کی حمایت میں لکھی تھی۔ مولانا رشید احمد، امیر امداد اللہ اور مولانا قاسم کے بعد دیوبندی جماعت کے امام ہوئے۔ آپ سے تین سو سے زیادہ مشائخ نے دینی علوم حاصل کئے۔ آپ کا سن وفات ۱۳۲۳ھ ہے۔

## ۴۰۔ حزب صادق پوری:-

بالاکوٹ کے حادثہ کے بعد باقی ماندہ مجاہدین نے امیر نصیر الدین دہلوی کے ہاتھ پر جو مولانا

محمد اسحاق کے داماد تھے بیعت کی تھی۔ لیکن بعد میں ان کی جماعت میں اختلاف رونما ہوا۔ بات یہ تھی کہ مجاہدین کو امیر شہید کا جنازہ نہ ملا تھا۔ چنانچہ اس کی وجہ سے ان کے دو گروہ بن گئے ایک گروہ جو بیشتر ارباب حل وعقد پر مشتمل تھا امیر شہید کی شہادت کا قائل تھا۔ لیکن دوسرا گروہ جو تعداد میں کم تھا امیر شہید کی موت کا انکار کرتا تھا۔ ان لوگوں نے بڑی مستعدی سے اس امر کی دعوت دینا شروع کی کہ امیر شہید زندہ ہیں، وہ شہید نہیں ہوئے اور عنقریب لوٹ کر آئیں گے۔ امیر شہید کے متعلق یہ دو خیال بالاکوٹ کے واقعہ کے بعد ہی پیدا ہو گئے تھے۔ طبعاً ان کا اثر ہندوستان میں مددگاروں کی جو جماعتیں تھیں، ان پر بھی پڑا۔ مولانا محمد اسحاق اور ان کی جماعت امیر شہید کی شہادت کو تسلیم کرتی تھی، لیکن اس کے برعکس مولانا ولایت علی عظیم آبادی (صادق پوری) کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ شہید نہیں ہوئے بلکہ کہیں غائب ہو گئے ہیں۔

مولانا ولایت علی شاہ اسمعیل شہید کے خواص اصحاب میں سے تھے اور سید احمد شہید آپ کو دعوت جہاد کے سلسلے میں ہندوستان بھیجا کرتے تھے۔ جب بالاکوٹ کا معرکہ ہوا تو مولانا ولایت علی وہاں موجود نہ تھے، اس لیے انہیں یقین تھا کہ سید احمد شہید کی شہادت نہیں ہوئی۔ یہ وجہ تھی جس کی بنا پر دونوں گروہوں میں اختلاف واقع ہوا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام دشمن جماعتیں تو مسلمانوں کا مذاق اڑاتیں اور کفار تھے کہ بلاد اسلامیہ پر قبضہ کرتے چلے جاتے تھے۔ جہاں تک شاہ محمد اسحاق کے بس میں تھا، وہ اور ان کی جماعت اپنے کام میں لگی رہی۔ لیکن تمام کوششوں کے باوجود دونوں گروہوں کا اختلاف کم نہ ہو سکا۔ آخر کار شاہ محمد اسحاق ہجرت کر کے حجاز چلے گئے اور مکہ میں ۱۲۶۲ھ میں آپ نے انتقال کیا۔ مولانا محمد اسحاق کی وفات کے بعد حزب ولی اللہ دو مستقل جماعتوں میں بٹ گئی۔ ایک جماعت حزب دہلوی کہلائی۔ اور دوسری صادق پوری تھی۔

امیر ولایت علی کی جماعت میں عام طور پر بہار اور بنگال والوں کی کثرت تھی۔ آپ نے انہیں تو بیعت جہاد کی دعوت دینی شروع کی اور اپنے آپ کو امیر شہید کا نائب قرار دیا۔ یہ ۱۲۴۰ھ کا واقعہ ہے۔ مولانا ولایت علی کی جماعت کا مرکز صادق پور (پٹنہ) تھا، اس لیے اس جماعت کا

نام حزب صادق پور پڑا۔ مولانا ولایت علی کے ساتھ مولانا عبدالحق بن فضل اللہ بنارسی بھی شریک ہو گئے۔ یہ موصوف شاہ اسمٰعیل شہید سے خاص تعلق رکھتے تھے اور آپ نے امام شوکانی سے بھی پڑھا تھا۔ ان لوگوں نے حزب صادق پوری کی تنظیم کا باقاعدہ کام کرنا شروع کر دیا۔ البتہ شاہ محمد اسحاق کے احترام کے پیش نظر یہ دہلی اور اطراف دہلی میں اپنی جماعت کا کھلم کھلا پروپیگنڈا نہ کرتے۔ امیر ولایت علی سنہ ۱۲۵۵ھ میں حجاز گئے۔ وہاں سے یمن پہنچے اور امام شوکانی سے استفادہ کیا۔

مولانا محمد اسحاق ہندوستان سے ہجرت کرکے حجاز چلے گئے تو امیر ولایت علی نے سنہ ۱۲۵۸ھ میں اپنے بھائی عنایت علی کو سرحد پار بونیر کے مقام پہ بھیجا جہاں امیر شہید کے باقی ماندہ مجاہدین ان کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ سنہ ۱۲۶۲ھ میں جب مولانا محمد اسحاق کا انتقال ہوا تو امیر ولایت علی خود بھی بونیر پہنچ گئے اور وہاں ایک حد تک ان کو کامیابی بھی ہوئی۔ سنہ ۱۲۶۹ھ میں امیر ولایت علی فوت ہوئے اور ان کی جگہ ان کے بھائی عنایت علی امیر بنے۔ مجاہدین کی یہ جماعت امیر شہید کا بڑا انتظار کرتی رہی۔ اس اثناء میں ان کا جہاد شروع کرنے پہ اتفاق نہ ہو سکا۔

دراصل حزب صادق پوری کا اساسی عقیدہ یہ تھا کہ امیر شہید غائب ہو گئے ہیں اور وہ ضرور لوٹیں گے۔ یہی سبب تھا کہ جب مسلمانوں کے امراء اور سلاطین کفار کے خلاف لڑنے کے لیے اٹھے تو حزب صادق پوری ان سے بے تعلق رہی۔ کیونکہ امیر شہید کے ظہور سے پہلے ان کے نزدیک کفار سے جہاد کیسے ہو سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود امیر عنایت علی کی جماعت میں ایسے مجاہدین بھی تھے جو اس خیال سے اتفاق نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اس معاملہ میں ان کا میلان طبع حزب دہلوی کی طرف تھا۔

حزب صادق پوری کے اکابر ائمہ میں سے ایک شیخ الاسلام سید نذیر حسین بہاری ثم دہلوی ہیں۔ آپ سنہ ۱۲۲۰ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۳۴ھ تک صادق پور ہی میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔ سنہ ۱۲۴۳ھ میں آپ دہلی آئے اور مولانا اسحاق سے پڑھا۔ آپ نہایت ذہین اور ذکی تھے۔ اور آپ کی ذات علوم نقلی، علوم عقلی اور ادبیات سب کی جامع تھی۔ آپ اپنے استاد مولانا محمد اسحاق کے

تبع میں حنفی فقہ کے مطابق فتوے دیتے تھے۔ فتاویٰ عالمگیری پر آپ کی اتنی نظر تھی کہ گویا آپ کو یہ ازبر یاد تھے۔ دراصل مولانا نذیر حسین کا رجحان حزب صادق پوری کی طرف بہت کم تھا۔ ۱۲۷۰ھ کے بعد آپ مستقل طور پر خود اجتہاد فرماتے اور اکثر معاملات میں شاہ اسمٰعیل شہید کا تتبع کرتے۔

حزب صادق پوری میں سے ایک نواب صدیق حسن خاں ہیں۔ موصوف امیر ولایت علی سے ملے تھے۔ اور شیخ عبدالحق بنارسی سے آپ کو تلمذ حاصل تھا۔ اس کے علاوہ علمائے یمن سے بھی آپ نے استفادہ کیا اور خاص طور پر امام شوکانی سے موصوف کو بڑا شغف تھا۔ (التمہید صفحہ ۲۰۴)

علاوہ ازیں حزب دہلوی اور حزب صادق پوری کے متعلق۔ التمہید صفحہ ۲۰۸ میں لکھا ہے۔

حزب دہلوی کا شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا محمد اسحاق کی طرف میلان تھا۔ ان کے مقابلے میں حزب صادق پوری سید احمد شہید کی طرف زیادہ میلان رکھتی تھی۔ لیکن دونوں کی دونوں جماعتیں امام ولی اللہ اور ان کے بعد امام عبدالعزیز اور ان کے بعد سید احمد شہید کے ماننے میں متفق تھیں۔ بعد میں حزب صادق پوری کا میل جول ظاہریہ محدثین یمن کے زیدیوں اور نجد کے حنبلیوں سے بڑھا اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ شاہ اسمٰعیل شہید کے مسلک سے الگ ہو گئے اور دونوں جماعتوں کے علوم و معارف میں بھی بڑا اختلاف پیدا ہو گیا۔

اگر شاہ اسمٰعیل کی "تقویۃ الایمان" اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی "کتاب التوحید" کو غور سے پڑھئے تو شرک کی عدم مغفرت اور توسل فی الدعا کے معاملے میں دونوں میں جو فرق ہے، صاف نظر آئے گا۔ اسی طرح اگر شاہ اسمٰعیل شہید کی "اصول فقہ" اور امام شوکانی کی "ارشاد الفحول" دیکھئے تو اجماع کے مسئلے میں دونوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ نیز اگر شاہ شہید کی کتاب "العبقات" پڑھئے تو ابن عربی کے فلسفہ کے متعلق ان کی رائے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے حنبلی مریدوں سے بالکل الگ ہے۔ چنانچہ مولانا نذیر حسین دہلوی ابن عربی کو کافر قرار نہ دینے کے معاملے میں شاہ اسمٰعیل شہید کے متبع تھے۔ کتاب "الحیات بعد الممات" میں لکھا ہے۔ میاں صاحب طبقۂ علمائے کرام

بیں شیخ محی الدین ابن عربی کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور انہیں "خاتم الولایۃ محمدیہ" کہہ کر پکارتے تھے
مولانا بشیر الدین قنوجی، جو شیخ اکبر کے مخالف تھے ایک مرتبہ دہلی اسی غرض سے تشریف لائے
کہ ان کے بارے میں میاں صاحب سے مناظرہ کریں۔ دو مہینے دہلی میں رہے۔ روزانہ مجلس مناظرہ
گرم ہوتی، مگر میاں صاحب اپنی عقیدت سابقہ سے جو شیخ اکبر سے تھی ایک تل برابر بھی پیچھے نہ
ہٹے۔ آخر مولانا ممدوح دو ماہ کے بعد واپس تشریف لے گئے۔ علیٰ ہذا القیاس مولانا ابو محمد بشیر ہسوی
نے بھی شیخ اکبر کے متعلق کئی دن تک متواتر میاں صاحب سے بحث کی اور "فصوص الحکم" پر اعتراضات
کئے۔ میاں صاحب نے پہلے تو سمجھایا مگر جب دیکھا کہ ابھی "لانسلم" ہی کے درجے میں ہیں تو فرمایا
کہ "فتوحات مکیہ" شیخ اکبر کی آخری تصنیف ہے اور اس لئے ان کی سب تصانیف سابق کی ناسخ
ہے۔ اس جملہ پر وہ سمجھ گئے۔ (یہ بیان یہاں ختم ہوا۔)

نواب صدیق حسن خاں نے بھی اپنی کتاب "التاج المکلل" میں ابن عربی کی عدم تکفیر کی
رائے دی ہے۔ لکھتے ہیں: "ابن عربی کے معاملے میں صحیح نقطۂ نظر وہی ہے جس پر محقق علماء
جو علم و عمل اور شریعت و سلوک دونوں کے جامع ہیں، عامل ہیں۔ وہ یہ کہ ان کے مسلک کے
متعلق سکوت اختیار کیا جائے۔ ان کے ہاں جو باتیں بظاہر شریعت کے خلاف ہیں، ان کی
اچھی تعبیر کی جائے اور ان کی تکفیر سے زبان کو روکا جائے۔ ان کے علاوہ اور جو شیخ گزرے
ہیں جن کا تقویٰ سب کے نزدیک مسلّم تھا، ان کے علم و فضل کو سب مسلمان مانتے تھے اور عمل صالح
میں وہ بلند مقام رکھتے تھے، ان کے معاملے میں بھی یہ مسلک اختیار کرنا چاہیے۔

## ۱۳۔ مولانا احمد علی سہارنپوری ؒ

آپ کے والد کا نام لطف اللہ انصاری تھا۔ موصوف نے مولانا مملوک علی، مولانا وجیہ الدین
سہارنپوری اور مولانا شاہ محمد اسحاق سے پڑھا۔ تحصیل علم کے بعد کچھ عرصہ آپ تعلیم و تدریس
میں مصروف رہے۔ پھر آپ نے دہلی میں "مطبع احمدی" کے نام سے ایک چھاپہ خانہ قائم کیا۔ درس

میں قرآن عظیم اور حدیث کی کتابوں کو بڑی صحت کے ساتھ چھاپا۔ آپ اپنے عہد میں حدیثوں کے حافظ تھے۔ موصوف نے شیخ الاسلام محمد قاسم کے ساتھ مل کر صحیح بخاری پر حاشیے لکھے۔ اس کے علاوہ آپ نے حدیث کی اور بہت سی کتابوں کی ذیول (شرحیں) لکھیں، جن کی وجہ سے ملک کے اطراف میں علم حدیث کو بڑا فروغ ہوا۔ آپ سے شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم اور ہمارے استاد حضرت شیخ الہند نے بھی استفادہ کیا۔ مولانا احمد علی نے ۱۲۹۷ھ میں انتقال فرمایا۔
(تمہید صفحہ ۲۶۹)

## ۱۴۔ مولانا شیخ محمد تھانوی:

تھانہ بھون کے یہ بزرگ مولانا شیخ محمد تھانوی محدث کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی رائے ۱۸۵۷ء کی تحریک حریت کے خلاف تھی۔ مولانا حسین احمد صاحب صدر دیوبند نے ایک مرتبہ سہارنپور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ امیر امداد اللہ، شیخ الاسلام محمد قاسم اور حضرت مولانا گنگوہی وغیرہ حضرات نے مولانا شیخ محمد کی مسجد میں جا کر جہاد حریت کے متعلق تبادلہ خیالات کیا۔ مولانا شیخ محمد نے اہل ہند کی بے سروسامانی کا ذکر فرما کر جہاد کی مخالفت کی۔ مولانا محمد قاسم نے فرمایا کہ کیا ہم اصحاب بدر سے بھی زیادہ کمزور ہیں؟ امیر امداد اللہ نے طرفین کی گفتگو سننے کے بعد فرمایا کہ الحمدللہ انشراح ہو گیا۔ اور واپس آ کر جہاد کی تیاری شروع کر دی۔ امیر امداد اللہ نے امامت قبول کی۔ شیخ الاسلام نانوتوی سپہ سالار قرار پائے اور شیخ الاسلام گنگوہی قاضی مقرر ہوئے۔

اس طرح قصبہ تھانہ بھون ایک دارالاسلام بنا لیا گیا۔ پھر پیش قدمی کر کے قصبہ شاملی ضلع مظفر نگر بھی فتح کر لیا۔

شیخ محمد تھانوی وہ بزرگ ہیں، جن کے مسلک پر مولانا اشرف علی کار بند ہیں اور شیخ الہند کی جماعت کی سیاست کو غلط مانتے ہیں۔ مولانا اشرف علی مرحوم کے سوانح حیات جو شائع ہو چکے ہیں، ان میں تصریح ہے کہ آپ مولانا شیخ محمد صاحب کے مسلک کے پیرو ہیں۔ مولانا شیخ محمد

اور امیر امداد اللہ ایک ہی مرشد کے خلیفہ ہیں۔ نہ ہی مسئلہ جہاد پر آپس میں مخالف ہوگئے تو جماعت
دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ چنانچہ اب امیر امداد اللہ کی جانشینی کا استحقاق مولانا اشرف علی صاحب
کو کس طرح پہنچ سکتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی خطرناک اشارہ ہے جو مولانا شیخ الہند اور ان کے
اساتذہ کے خصوصی کاموں کو بیکار بنا دینا چاہتی ہے۔

## ۳۴۔ مولانا محمود حسن:۔

مولانا محمود حسن شیخ الہند میرے استاد تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ قیام میں میرا ان پر
تمام تر اعتماد تھا۔ آپ کے والد کا نام ذوالفقار علی تھا۔ موصوف کا سلسلۂ نسب قریش کے اموی خاندان
سے ملتا ہے۔ مولانا محمود حسن ۱۲۶۸ھ یا ۱۸۵۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی کتابیں آپ نے اپنے والد
اور چچا سے پڑھیں۔ ۱۲۸۳ھ یا ۱۸۶۶ء میں جب مدرسہ دیوبند کی بنیاد پڑی تو مولانا اس میں
داخل ہوگئے اور مولانا محمد یعقوب بن مملوک علی اور مولانا محمود دیوبندی سے پڑھا۔ آپ شیخ
الاسلام مولانا محمد قاسم کی صحبت میں رہے اور موصوف سے بہت استفادہ کیا۔ آپ نے مولانا
احمد علی، شیخ محمد مظہر نانوتوی اور شیخ عبدالرحمٰن پانی پتی سے تدریس و تعلیم کی اجازت طلب کی
اور ان سب بزرگوں نے موصوف کو اس کام کا اہل پاکر اجازہ علمی سے مرحمت فرمایا۔

شیخ الاسلام محمد قاسم مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو وہاں مولانا عبدالغنی سے بھی مولانا محمود حسن
کے لیے "اجازہ علمی" حاصل کیا۔ اس کے علاوہ اپنے استاد مولانا محمد قاسم کی تعمیل ارشاد کرتے
ہوئے آپ نے حاجی امداد اللہ سے اکتساب فیض کیا۔ جن بزرگوں نے شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم سے علم
حاصل کیا تھا۔ ان میں سے تین حضرات خاص طور پر مشہور اور ممتاز ہوئے۔ لیکن ان میں سے
حضرت شیخ الہند کو اپنے استاد سے سب سے زیادہ محبت تھی۔ وہ ان کے علوم پر سب سے
زیادہ حاوی تھے۔ اور ان کے اتباع میں موصوف کو سب سے زیادہ شغف تھا۔ میں (مولانا سندھی)

نے آپ سے شیخ الاسلام مولانا محمد قاسم کی کتاب "حجۃ الاسلام" پڑھی۔ کتاب پڑھتے پڑھتے کبھی
کبھی میں یوں محسوس کرتا جیسے علم اور ایمان میرے دل میں اوپر سے نازل ہو رہا ہے۔ حضرت شیخ الہند
کی ذاتِ اقدس کے متعلق میرا یہ عقیدہ ہے کہ وہ فطرتاً بڑے ذکی اور ذہین تھے۔ موصوف کا شمار
ان بزرگوں میں سے ہو سکتا ہے، جنہیں امام ولی اللہؒ کی اصطلاح میں "مفہمین" کہا جاتا ہے۔ آپ
اپنے استاد سے بڑی عقیدت رکھتے، اور ان کی متابعت میں ہر دم کوشاں رہتے۔ آپ کو شیخ الاسلام
مولانا محمد قاسم سے تواضع اور انکسار کی نسبت تھی۔ اسی نسبت کو امام ولی اللہؒ نے اپنی کتابوں
میں "نسبت اہل بیت" کا نام دیا ہے۔ حضرت شیخ الہند نے ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ نومبر
۱۹۲۰ء کو امام عبدالعزیز کی وفات کے پورے سو سال بعد انتقال فرمایا۔

# ضمیمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں — آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

إِنَّ وَلِيِّيَ اللّٰهُ الَّذِي نَزَّلَ الْكِتَابَ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِينَ ۔

الحمد للہ رب العالمین وصلی اللہ علی سیدنا محمد سید المرسلین وخاتم النبیین وعلی آلہ واصحابہ واتباعہ ائمۃ الدین وعلیٰ عباد اللہ الصالحین وبارک وسلم۔

اما بعد۔ آج ہم نے خدا کا نام لے کر اور اسی کی مدد پر اعتماد کر کے شمال مغربی ہند کی نئی سیاسی جماعت "جتھا" نو بنا شدہ ساگر پارٹی کے پہلے مقرر کا کام سندھ میں شروع کرنے کا ارادہ کیا۔

پارٹی کے چند اساسی قواعد ہم نے ضبط کر لئے ہیں تا کہ خواص کو دعوت دینے میں آسانی ہو۔ ان میں اکثر وہی باتیں ہیں جو سیاسی مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک علوم متعارفہ کا حکم رکھتی ہیں اس لیے ان کی مزید تشریح کی اس مقدمہ میں ضرورت نہیں۔ البتہ پارٹی کے میدانِ عمل کو محدود کرنے کا اشارہ قابلِ وضاحت ہے۔

جس مبصر کو گذشتہ تیس برس کی تاریخ پیش نظر ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان کا سیاسی مقدمہ اتنا مشکل نہیں، جیسا کہ اس سے پہلے سمجھا جاتا تھا، لیکن اُس پر یہ امر بھی ساتھ ہی منکشف ہو جاتا ہے کہ یہ کھیل جب بھی بگڑ گیا ہے تو اس کی تہ میں ہندو مسلم اختلاف ہی باعث نظر آتا ہے۔

اس اختلاف کو حل کرنے کے لیے متفرق طور پر سیاسی تجاویز بنائے گئے مگر عملاً یہ

"مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"

کا منظر سامنے آتا ہے۔

ہم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے عمل اشتراک کے ساتھ ساتھ ان میں فکری اتحاد کا خمیر بھی لگا دیا ہے۔ اس طرح ہم ایک نیا تجربہ کرانا چاہتے ہیں۔ اسی سے ہم نے اپنی تحریک کے لیے ایک ایسا قطعہ زمین انتخاب کیا ہے جو دونوں تہذیبوں کا مرکز ہے۔

جس طرح گنگا جمنا کا دوآبہ ہندو تہذیب کا منبع ہے، اسی طرح سندھ ساگر مسلم تہذیب کا معدن ہے۔ اگر ہم ان دو عظیم انسانی قطعات کا اپنے نظریہ پر سمجھوتہ کرا سکے، اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی تالیف قلوب پر قادر ہو سکے تو اس لاینحل مشکل کی کلید مل جائے گی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اسکندریہ میں حکماء کا ایک طائفہ نو فلاطونی پیدا ہوا تھا۔ اسی منہاج پر مسلمانوں میں کئی حکیم پیدا ہوئے، جن میں سے الشیخ الاکبر محی الدین ابن عربی اور شیخ الاشراق شیخ شہاب الدین السہروردی مشہور عالم ہیں۔

ہندوستان میں سلطان محمود غزنوی کے زمانے سے صوفیائے کرام کی آمد شروع ہوئی۔ سلطان شہاب الدین غوری کے بعد اس ملک سے تصوف کے چاروں طریقوں میں کثرت سے معرفت الٰہی میں کامل خادم انسانیت پیدا ہوئے۔ وہ سب اسی مسلک اشراقی کے امام تھے، مگر ایسا عالم جو اپنے انکشافات اور نظریات کی تدوین و تنظیم پر قادر ہو، امام ولی اللہ دہلوی جیسا پیدا نہیں ہوا۔

ان تمام تر تصوف کا مرکزی فکر وحدت الوجود ہے، جو ویدانت فلاسفی کا اصل الاصول ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اسی کی تہذیب و تکمیل سے انسانیت کی تشریح کی اور اسی کو کتاب و سنت